(قسط۔۱)

عیسوی تبصرہ

آیۃ اللہ العظمیٰ سید العلما مولانا سید علی نقی نقوی طاب ثراہ

جناب والا! اگر فرشتہ کی بشارت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو فوریت کا پتہ دیتی تو جناب مریمؑ کا استعجاب بے محل تھا کیونکہ عادتاً عورت ہمیشہ کنواری نہیں رہتی، کبھی نہ کبھی عقد ہوتا ہے۔ اور فرشتہ کا کلام بھی اگر یہی تھا کہ تمہارے یہاں کسی حصہ عمر میں اولاد ہوگی تو نظام عادی کے موافق فوراً ذہن میں یہی بات آجانا چاہئے کہ عقد کے بعد فرزند ہوگا۔

اس کی عرفی مثال یہ ہے کہ کسی لڑکی سے یہ کہئے کہ تمہارے بیٹا ہوگا تو کبھی اسے حیرت نہ ہوگی بلکہ فوراً طبیعت بتلائے گی کہ عقد ہوگا اور اس کے بعد ولادت ہوگی۔ یہی صورت یہاں بھی ہے۔ مگر جناب مریمؑ کو تعجب ہوا، اور اس قدر کہ ضبط نہ ہوسکا۔ کہہ بیٹھیں کہ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ وَلَدٌ وَّلَمْ یَمْسَسْنِیْ بَشَرٌ، (سورہ آل عمران ۷ ۴/) یہ حیرت واستعجاب اس بات کی دلیل ہے کہ اصل خوشخبری کے ساتھ کچھ قرائن حالیہ و مقالیہ اس امر کو بتلاتے تھے کہ یہ ولادت بحالت موجودہ ہی ہوگی اور اسی بنا پر مریمؑ کو تعجب ہوا۔ اس کے بعد فرشتہ نے رفع تعجب یہ کہہ کے نہیں کیا کہ ہاں عقد ہوگا، اس کے بعد ولادت ہوگی بلکہ عموم قدرت صمدیت کا پتہ دے کے مریمؑ کی تسکین کی، جس سے واضح ہوتا ہے کہ ولادت نظام عادی کے خلاف تھی۔

کَذٰلِکَ کے معنی یہ کہنا کہ (ایسا ہوگا) یعنی تمہیں مرد چھوئے گا اور تمہارے اولاد ہوگی'' مدیرنگار کی ایجاد ہے۔ مشارٌ الیہ اس کے قبل اثبات نہیں بلکہ نفی ہے، چھونے کا ذکر نہیں بلکہ نہ چھونے کا تذکرہ ہے، لہٰذا چھونا مرجع اشارہ کیوں کر ہوسکتا ہے۔ جس چیز پر تعجب تھا۔ کَذٰلِکَ سے اسی کی طرف اشارہ ہے اور وہ تعجب اس بات پر تھا کہ بغیر مرد کے چھوئے ولادت ہوگی، اسی بات کی طرف کَذٰلِکَ کا اشارہ ہے کہ ہاں یونہی ہوگا کہ ولادت بغیر مسِ بشر ہو۔

بالکل اس کے نظیر، اس کے قبل کی آیات ہیں جن میں ولادت حضرت یحیٰؑ کا تذکرہ ہے۔

قَالَ رَبِّ اَنّٰی یَکُوْنُ لِیْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِیَ الْکِبَرُ وَامْرَاَتِیْ عَاقِرٌ قَالَ کَذٰلِکَ اللّٰہُ یَفْعَلُ مَا یَشَآءُ۔

(سورہ آل عمران ۴۰/)

زکریاؑ نے کہا پروردگار میرے یہاں لڑکا کیوں کر ہوسکتا ہے حالانکہ میں کبیر السن ہوں اور میری عورت بانجھ ہے۔ ارشاد ہوا کہ ہے تو ایسا ہی (مگر) خدا جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ اس مقام پر کَذٰلِکَ کے یہ معنی نہیں کہ تمہاری کبرسنی کو خدا دور کرے گا، اور شباب عود کر آئے گا، پھر اولاد ہوگی، بلکہ جواب میں فرشتہ نے کہا کہ ہاں ان ہی موانع کے باوجود اولاد ہوگی۔ خدا تو قادر ہے جو چاہتا ہے وہ کرتا ہے۔ پھر جب اس آیت میں کَذٰلِکَ کے یہ معنی ہیں تو اس آیت میں مفہوم بدلنے پر کیا دلیل ہے؟ پھر تیسری آیت سورۂ مریمؑ کی جس میں کَذٰلِکَ کی لفظ ہے اور اس

میں مدیر نگار کے طبعزاد معنی بن سکتے ہی نہیں، مریمؑ کہتی ہیں۔

اَنّٰى يَكُوْنُ لِىْ غُلٰمٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِىْ بَشَرٌ وَّلَمْ اَكُ بَغِيًّا۔

(سورۂ مریمؑ آیت نمبر ۲۰/)

''میرے بیٹا کیوں کر ہوسکتا ہے درآں حالیکہ مجھے کسی انسان نے نہیں چھوا اور نہ میں نے کبھی بدکاری کی۔''

فرشتہ جواب دیتا ہے كَذٰلِكِ (ایسا ہی ہوگا) کیوں جناب نیاز! کیا آپ کی بنا پر ''ایسا ہی ہوگا'' کے یہ معنی کہے جائیں ''نعوذ باللہ (ایسا ہی ہوگا) یعنی تمہیں مرد چھوئے گا اور تم بدکاری کروگی اور پھر تمہارے اولاد ہوگی۔''؟

اگر آپ کا ضمیر اجازت دے دے تو یوں ترجمہ کیجئے، ہم تو حضرت مریمؑ کی قدس وجلالت کو دیکھتے ہوئے اس ترجمہ سے معذور ہیں۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ كَذٰلِكِ کے معنی یہ ہیں کہ ہے تو ایسا ہی کہ نہ تم کو کسی بشر نے مس کیا اور نہ تم نے کبھی فعل بد کیا، مگر پھر بھی فرزند ہوگا۔

جب دو آیتیں نظیر میں موجود ہیں تو آیت سورۂ آل عمران میں بھی كَذٰلِكِ کا یہی مطلب سمجھو۔ اب سورۂ مریمؑ کی آیتوں پر غور کیجئے۔

فرشتہ کا آکے بشارت فرزند دینا، اور مریمؑ کا تعجب، پھر اس کا خداوند عالم کے کمال قدرت سے رفع استعجاب، اس کے بعد مریمؑ کا حاملہ ہونا، اور دردزہ کی تکلیف برداشت کرنا، اور ایک درخت خرما کے نیچے آکے وضع حمل ہونا وغیرہ وغیرہ۔۔۔۔۔ یہ تمام واقعات ایک نظام میں ذکر ہوئے ہیں جس کا یقینی ظاہر یہ ہے کہ تمام واقعات مسلسل اور منتظم ہیں جن میں کوئی تفرقہ نہیں، ادھر فرشتہ نے بشارت دی اور ادھر جناب مریمؑ کے بطن میں استقرار حمل ہوگیا، نہ یہ کہ اس نے بشارت دی اور اس وقت تک جناب مریمؑ کا عقد نہ ہوا تھا، اس کے بعد عقد ہوا، اور پھر استقرار حمل ہوا، یہ نص قرآن کے خلاف ہے۔ مدیر نگار لکھتے ہیں کہ یہ تمام جملے ''ف'' سے شروع کئے گئے ہیں جس سے ترتیب واقعات تو ضرور ظاہر ہوتی ہے لیکن قرب زمانی سے اس کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بعض لوگ غلطی سے سمجھتے ہیں کہ یہ تمام واقعات فوراً ہو گئے۔ یعنی فرشتہ کا آنا، مریمؑ کا حاملہ ہونا، وضع حمل ہوجانا، اور مسیحؑ کا بولنا، یہ سب ایک ہی ساعت یا دن میں ہوگیا حالانکہ مقصود صرف واقعات کو اس ترتیب سے ظاہر کرنا ہے نہ یہ کہ وہ فوراً وقوع میں آ گئے۔''

یہ تمام طول کلام کتب فن سے بے خبری کا نتیجہ ہے ورنہ ''ف'' کی دلالت فوریت کے اوپر قابل انکار نہیں ہے۔ ملا جامی نے بھی تصریح کردی ہے کہ الفاء للترتیب ای للجمع مع الترتیب بغیر مھلۃ۔ ''ف'' ترتیب کے لئے ہے بغیر مہلت وتاخیر کے۔ کیا یہ فوریت نہیں ہوئی؟

اور اگر ''ف'' عدم تاخیر ومہلت کے لئے نہ ہو تو پھر ''ف'' اور ''ثم'' میں فرق کیا ہوگا؟

اسی جہت سے ابن عباس کا قول ہے کہ مریمؑ کے پاس فرشتہ کا آنا اور استقرار حمل اور وضع حمل سب یکے بعد دیگرے ایک ہی روز میں ہوا ہے۔ چنانچہ اس کی تفسیر نیشاپوری میں لکھی ہے۔

لفاء ات التعقیب فی قولہ "فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا فَاَجَآءَهَا الْمَخَاضُ"۔

(سورۂ مریمؑ آیت ۲۲/، ۲۳/)

اس لئے کہ فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَانًا قَصِيًّا میں ہر جگہ فائے تعقیب لائی گئی ہے۔ جو فوریت پر دلالت کرتی ہے۔

اور یہ مسلم نہیں ہے کہ مکان قصی یعنی دور مقام سے مراد ناصرہ یا مصر ہے بلکہ بنا برقول ابن عباس مکان قصی سے مراد پشت کوہ اپنے اہل قرابت سے دور ہے۔

اس کے بعد یہ آیات تو حضرت عیسیٰؑ کی ولادت پر کوئی پردہ خفاء رکھتے ہی نہیں۔

فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يا مَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْـًٔا فَرِيًّا يا اُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَاَ

سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيّاً فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا
كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيّاً قَالَ اِنِّيْ
عَبْدُاللّٰهِ اٰتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيّاً ۔

(سورۂ مریمؑ آیت ۲۷تا ۳۰)

حضرت عیسیٰؑ کو لے کے اپنی قوم کے پاس آئیں تو ان لوگوں نے کہا اے مریمؑ! تم نے عجیب کام کیا ہے، حالانکہ نہ تمہارا باپ برا آدمی تھا نہ تمہاری ماں بدکار تھی۔ یہ سن کر انہوں نے حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا کہ (اسی سے پوچھو)۔ ان لوگوں نے کہا ہم کیوں کر بات کریں اس بچہ سے جو ابھی گہوارہ میں ہے۔ عیسیٰؑ نے کہا کہ میں اللہ کا بندہ ہوں مجھے کتاب دی ہے اور مجھ کو نبیؑ بنایا ہے۔

ہمارے مخاطب کا خیال ہے کہ اَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ یعنی مریمؑ عیسیٰؑ کو قوم کے مابین لائیں۔ یہ حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کے بعد ہی کا تذکرہ نہیں ہے بلکہ یہ وہ وقت تھا کہ جب حضرت عیسیٰؑ سن تمیز کو پہنچ چکے تھے اور جو گفتگو حضرت عیسیٰؑ نے کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب حضرت عیسیٰؑ پیغمبر ہو چکے تھے اور ان کو کتاب الٰہی مل چکی تھی اور یہ امر ظاہر ہے کہ آپ کو نبوت ۳۰؍سال کی عمر میں ملی ہے۔'' لیکن آپ کو معلوم ہونا چاہئے کہ حضرت عیسیٰؑ کا ۳۰؍سال کی عمر میں نبی ہونا مسلّم نہیں ہے بلکہ علامہ نیشاپوری تحریر فرماتے ہیں۔

اکمل اللہ عقلہ واستنباہ طفلاً بل فی بطن امہ۔

خداوند عالم نے حضرت کی عقل کو بچپنے ہی میں کامل کر دیا اور اسی زمانہ میں بلکہ شکم مادر ہی میں نبیؑ بنا دیا تھا۔

وقیل ارادانہ سبق فی قضائہ اوجعل الاتی لامحالہ کانہ قدوجدوالاول اظہر وصغر الجسم لا ینافی کمال العقل وخرق العادۃ فیہ اکثر قالوا ان کمال عقلہ فی ذالک الوقت خارق العادۃ فیکون المعجز متقدماً علی التحدی وھو غیر جائز ولوکان نبیاً فی ذالک الوقت وجب ان یشتغل بیان الشرایع والاحکام ولو وقع ذالک لا شتھر ونقل والجواب انّ بعض معجزات النبی لا بدان یکون مقروناً بالتحدی اما الکل فممنوع وبعبارۃ اخری التحدی لابدان یکون مقروناً بفعل خارق عن العادۃ ولکن کل فعل خارق للعادۃ فانہ لا یلزم اقترانہ بالتحدی وکذا الکلام فی بیان الشرائع فان بعض اوقات النبی لابدان یقرن بہ دون کل اوقاتہ وحالاتہ علی انہ اشارالی بعض لتکالیف بقولہ واوصانی بالصلوٰۃ والزکوٰۃ۔

کسی نے کہا کہ مقصود عیسیٰؑ کا یہ تھا کہ خدا کی مشیت میں مقرر کرنا میرا گذر چکا ہے یا جو بات ضروری ہونے والی تھی اس کو بمنزلہ موجود فرض کیا ہے مگر پہلی بات ظاہر تر ہے اور قد کی کوتاہی کمال عقل کے منافی نہیں اور اعجاز کی شان اس میں زیادہ ہے۔ کچھ لوگوں نے کہا ہے کہ اس وقت عقل کا کامل ہونا خلاف عادت ہے لہٰذا معجزہ پہلے تحدی کے ہوجائے گا اور یہ جائز نہیں، دوسرے اگر نبی ہوتے اس وقت میں تو تبلیغ شرایع واحکام میں مصروف ہوجانا چاہئے، اور اگر ایسا ہوتا تو شہرت پذیر ہوتا اور ہم تک پہنچتا۔ جواب یہ ہے کہ بعض معجزات نبی کے ساتھ تحدی ہونا ضروری ہے لیکن سب میں ایسا ضروری نہیں ہے، دوسرے لفظوں میں یوں سمجھو کہ تحدی کو کسی نہ کسی معجزہ کے ساتھ ہونا ضروری ہے لیکن ہر معجزہ تحدی کے ساتھ ہو اس کی ضرورت نہیں ہے اور یہی کلام بیان شرایع میں بھی ہے کہ بعض اوقات نبیؑ میں تبلیغ ضرور ہونا چاہئے لیکن تمام اوقات وحالات میں بیان شرایع نبیؑ کے لئے لازم ہو یہ درست نہیں ہے۔ باوجودیکہ بعض تکالیف کی تبلیغ کی طرف تو حضرت عیسیٰؑ نے اوصانی بالصلوٰۃ کہہ کے اشارہ کر ہی دیا۔

مدیر نگار لکھتے ہیں ''قوم کا یہ کہنا کہ اس سے کیا بات کریں جو گہوارہ میں بچہ تھا (یعنی انہوں نے لفظ کان کا استعمال کیا ہے جس سے زمانہ ماضی ظاہر ہوتا ہے نہ یہ کہ وہ فی الحال گہوارہ کے

بچہ ہیں) اس سے بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس وقت حضرت عیسیٰؑ بچہ نہ تھے۔'' احسنت!!

آپ کَانَ کے معنی صرف یہی سمجھتے ہیں کہ پہلے یہ بات تھی اور اب نہیں ہے۔ مگر ان آیات کا ترجمہ کرنا آپ کے ذمہ ہے۔

پہلی آیت۔ كَانَ اللهُ عَزِيْزًا حَكِيْماً۔ **دوسری آیت** كَانَ اللهُ عَلىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرًا۔ **تیسری آیت** ما كان الله ان يتخذ من ولد۔ **چوتھی آیت** ما كان الله ان يظلم۔ **پانچویں آیت** ان الشيطان كان للرحمان عصياً۔ **چھٹی آیت** مَا كَانَ رَبُّكَ نَسِيًّا۔

ان کا ترجمہ آپ کے مذاق پر علی الترتیب یوں ہوگا۔

۱۔ خدا عزیز و حکیم تھا۔ (مگر اب نہیں)

۲۔ خدا ہر شئے پر قادر تھا (نہ فی الحال)

۳۔ خدا کے لئے یہ بات سزاوار نہ تھی کہ اس کے کوئی بیٹا ہو۔ (نہ یہ کہ فی الحال اس کے لئے سزاوار نہیں)

۴۔ خدا کے لئے یہ بات زیبا نہیں ہے کہ وہ ظلم کرے (مگر فی الحال زیبا ہے)

۵۔ شیطان خداوند عالم کا نافرمان تھا (مگر اب انتہا کا اطاعت گزار)

۶۔ تمہارا پروردگار، بھلکڑ نہیں تھا۔ (اب کا ذکر نہیں)

اگر مدیر نگار اس ترجمہ پر راضی ہوں تو اس آیت میں بھی ان کا قول صحیح سمجھا جاسکتا ہے مگر افسوس ہے کہ کوئی متدین اور سمجھدار ان ترجموں پر راضی نہیں ہوسکتا۔ اب کَانَ کے معنی سمجھو۔

مشہور و مستند مسلم الثبوت امام فن جار اللہ زمخشری لکھتے ہیں:

كان لا يفاء مضمون الجملة فى زمان ماض مبهم يصلح للقريب والبعيد وهيهنا للزمان القريب عن الحال بدلالة الحال۔

کَانَ مضمون جملہ کو واقع کرنے کے لئے ہوتا ہے ایک زمانہ ماضی مبہم میں کہ جس سے زمانۂ قریب بھی مراد لیا جاسکتا ہے اور زمانۂ بعید بھی اور اس آیت میں یہی زمانہ مراد ہے۔ متصل ہے بقرینہ حالت۔

اب کَانَ کے معنی واضح ہوگئے، اور یہ معنی نہیں ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ پہلے گہوارہ میں تھے اور اب نہیں ہیں۔ درحقیقت یہ تمام لغزشیں اور خرابیاں تصریحات ائمہ فن اور کلمات اعلام سے غض بصر اور ناواقفیت کا نتیجہ ہوا کرتی ہیں۔

الجهل داء لا دواء له: یہ مدیر نگار کے تفکہات کا جواب تھا اور اگر ہم سے دلیل پوچھتے ہیں اس بات کی کہ مریمؑ کا عیسیٰؑ کو قوم کے پاس لانا ولادت کے بعد ہی کا واقعہ ہے تو سنئے تحملہ کی لفظ کو نہ ہم اس مطلب کی دلیل سمجھتے ہیں نہ اس سے ثبوت لاتے ہیں بلکہ ثبوت یہ ہے کہ وقت ولادت عیسیٰؑ فرشتہ نے تحت شجرہ سے جو کلام کیا تھا اس کو خداوند عالم نے بایں الفاظ نقل فرمایا۔

فَنَادٰهَا مِنْ تَحْتِهَا اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْٓ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَباً جَنِيًّا فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْناً فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَداً فَقُوْلِيْٓ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْماً فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا۔

(سورۂ مریمؑ آیت ۲۴ تا ۲۶ر)

فرشتہ نے زیر درخت سے آواز دی کہ رنجیدہ نہ ہو خدا نے تمہارے نیچے ایک نہر جاری کی ہے، اور اپنی طرف درخت کی ٹہنی کو حرکت دو کہ تمہارے اوپر رطب تازہ گریں، ان کو کھاؤ اور پانی پیو اور چشم کو خشک کرو۔ اگر کسی انسان کو دیکھنا تو کہنا میں نے خدا کے لئے روزہ نذر کیا ہے لہٰذا آج میں کسی سے بات نہیں کروں گی۔

ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ رجب ۱۳۴۵ھ ر فروری ۱۹۲۶ء



عیسوی تبصرہ

بانی اسلام علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حفظ ملت خیر الانام کا عہد جو خیر القرون کے لقب کا طرہ امتیاز رکھتا تھا، جس قدر بعید ہوتا جاتا ہے اتنا ہی مذہب کا مطلع غبار آلود ہورہا ہے اور دینی آئینہ پر گرد شبہات بیٹھ رہی ہے۔ اسلام کا حق نما چہرہ اگر چہ

حقیقی علم وفہم کی روشنی میں کسی وقت نقاب پوش نہیں ہے مگر خدا برا کرے تسویلات نفسانی ووساوسِ شیطانی کا، جو بصارت و بصیرت دونوں پر پردہ ڈال کے شب پر صفت نور آفتاب کو تاریک دکھا رہے ہیں۔ مادہ پرستی ودہریت کی ترقی ہوتی جاتی ہے اور نظام عادی کو الذین لا یعقلون کی عقلیں قہری سمجھتے ہوئے غیر ممکن التبدل خیال کرنے لگے ہیں۔ اسی بنا پر معجزات انبیاؑ سے انکار ہے۔ خوارق عادات کا یقین نہیں آتا۔ مادیین و دہریین کو جانے دو، نام کے مسلمان بھی اس مرض میں مبتلا ہیں کہ کسی نبی کے خارق عادت یا معجزہ کو سن کے تکذیب پر تل جاتے ہیں۔

اس وقت ہمارے سامنے بھوپال کا مشہور ادبی وعلمی رسالہ ''نگار'' مجریہ ستمبر ۱۹۲۶ء موجود ہے اور جناب نیازؔ فتحپوری مدیر رسالۂ مذکورہ کا مضمون ''حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام'' کے عنوان سے ہمارے پیش نظر ہے۔ جس کا تبصرہ ہمارا اسلامی فرض ہے کیونکہ اس مضمون میں تمام تصریحات قرآن مجید اور احادیث صحیحہ کی رکیک تاویلات اور شاعرانہ تخیلات پر اعتماد کرکے تکذیب کی گئی ہے جو اسلامی حدود میں کسی طرح قابل قبول نہیں ہے۔

ابتدائے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے قبل آپ حضرت خضر کے متعلق بھی کچھ گہر افشانی فرما چکے ہیں۔ لیکن افسوس ہے کہ ہم ان مطالب سے بہرہ مند نہیں ہوئے تاکہ ان کی صحت وسقم پر نظر کی جائے۔

اس وقت ہمیں حضرت عیسیٰؑ کے متعلق مدیر نگار سے تین ابواب میں گفتگو کرنا ہے، کیونکہ ان کے افکار کا نقطۂ نظر تین ہی منزلوں پر منتہی ہے۔

پهلا باب

حضرت عیسیٰؑ کی ولادت

اس باعین ہم سب سے پہلے ان آیات مبارکہ کو مع صحیح ترجمہ کے تحریر کریں گے، جن میں جناب اقدس الٰہی عزاسمہٗ نے حضرت عیسیٰؑ بن مریم علیہا السلام کا ذکر فرمایا ہے اور اس کے بعد پھر ان آیات پر تفصیلی نظر ڈال کر ان غلط فہمیوں پر روشنی ڈالیں گے جو مدیر نگار سے ان کے ترجمہ اور مطلب میں واقع ہوئی ہیں۔

ہمارے مخاطب حضرت عیسیٰؑ کی ولادت بن باپ کے تسلیم نہیں کرتے اور اس کو مافوق العادت اور خلاف عقل ہونے کی جہت سے ماننے پر تیار نہیں ہیں۔

ہم مافوق العادۃ تسلیم کرنے پر تو آمادہ ہیں لیکن خلاف عقل سمجھنے سے قاصر ہیں کیونکہ اس دعویٰ کو کسی دلیل عقل سے ثابت کرنے کی کوئی کوشش نہیں کی گئی اور کوئی عقلی استحالہ کسی نظریہ یا ہدایت کے حوالہ سے پیش نہیں کیا گیا اور افسوس ہے کہ باوجود اس طول فضول کے اسی ضروری جز کو ترک کر دیا گیا۔ اب رہا فرق عادت تو اس کو وہی محال سمجھ سکتا ہے جو نظام عادی کی قرار داد کے بعد اس میں کسی مافوق العادۃ موثر کی تاثیر کا قائل نہ ہو اور اس کو موثر سے بے نیاز سمجھتا ہو۔ ہمارے نزدیک تو جو اس نظام عادی کا قائم کرنے والا ہے وہی کسی خاص مصلحت سے اس کے تغیر پر بھی قادر ہے۔ یَمْحُو اللّٰہُ مَا یَشَآءُ وَ یُثْبِتُ (سورۂ رعد ۹ ؍ ۳۹) حضرت عیسیٰؑ کی ولادت بغیر کسی باپ کے قرآن مجید کے بیشتر کلمات سے ثابت اور نصوص قطعیہ سے معلوم ہے جن کا انکار تکذیب قرآن ونصوص تک منتہی ہے۔

ان آیات میں واضح تر آیات سورۂ آل عمران اور سورۂ مریمؑ کے ہیں، مگر چونکہ لائحہ نگار صاحب نے ان آیات کے ترجمہ میں اپنے مطلب کے موافق بہت سی اصلاحیں دی ہیں اور اس فرض دیانت وامانت کو بالکل ترک کر دیا ہے جو ایک مترجم کی حیثیت سے ان پر عائد ہوتا تھا۔ (جس کی خود آپ مولانا شاعرؔ صاحب سے آئندہ مضمون میں شکایت کرتے ہیں۔

خود ناگرفته پند مده پند دیگران

لہٰذا ہم ان آیات کو مع صحیح ترجمہ کے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِکَۃُ یٰمَرْیَمُ اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنْہُ اسْمُہُ الْمَسِیْحُ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ وَجِیْھًا فِی

الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً وَّمِنَ الصَّالِحِيْنَ قَالَتْ رَبِّ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ وَلَدٌ وَّلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ قَالَ كَذٰلِكِ اللّٰهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ اِذَا قَضٰى اَمْراً فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔

(آل عمران آیت ۴۰/۴ تا ۴۲/۴)

اور جب فرشتوں نے کہا کہ اے مریمؑ یقین جانو کہ خدا خوشخبری دیتا ہے تم کو اپنے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ ہوگا، وہ دنیا و آخرت میں روادار ہوگا، اور خدا کے مقربین میں سے ہوگا، وہ لوگوں سے گہوارہ میں اور آخر عمر میں (یکساں بات کرے گا) اور وہ نیکو کاروں میں سے ہوگا۔ مریمؑ نے کہا کہ اے میرے رب! میرے لڑکا کیسے ہوسکتا ہے؟ حالانکہ مجھے کسی انسان نے نہیں چھوا ہے۔ کہا ہاں، ہے تو یوں ہی (مگر) خداوند عالم پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو وہ کہہ دیتا ہے ہوجا، وہ کام ہوجاتا ہے۔

وَاذْكُرْ فِي الْكِتَابِ مَرْيَمَ اِذِ انْتَبَذَتْ مِنْ اَهْلِهَا مَكَانًا شَرْقِيّاً فَاتَّخَذَتْ مِنْ دُوْنِهِمْ حِجَابًا فَاَرْسَلْنَا اِلَيْهَا رُوْحَنَا فَتَمَثَّلَ لَهَا بَشَراً سَوِيّاً قَالَتْ اِنِّيْ اَعُوْذُ بِالرَّحْمٰنِ مِنْكَ اِنْ كُنْتَ تَقِيّاً قَالَ اِنَّمَا اَنَا رَسُوْلُ رَبِّكِ لِاَهَبَ لَكِ غُلَاماً زَكِيًّا قَالَتْ اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلَامٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِيْ بَشَرٌ وَلَمْ اَكُ بَغِيًّا قَالَ كَذٰلِكِ قَالَ رَبُّكِ هُوَ عَلَيَّ هَيِّنٌ وَلِنَجْعَلَهٗ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحْمَةً مِّنَّا وَكَانَ اَمْرًا مَّقْضِيًّا فَحَمَلَتْهُ فَانْتَبَذَتْ بِهٖ مَكَاناً قَصِيًّا فَاَجَاءَهَا الْمَخَاضُ اِلٰى جِذْعِ النَّخْلَةِ قَالَتْ يَالَيْتَنِيْ مِتُّ قَبْلَ هٰذَا وَكُنْتُ نَسْيًا مَّنْسِيّاً فَنَادَاهَا مِنْ تَحْتِهَا اَلَّا تَحْزَنِيْ قَدْ جَعَلَ رَبُّكِ تَحْتَكِ سَرِيًّا وَهُزِّيْ اِلَيْكِ بِجِذْعِ النَّخْلَةِ تُسَاقِطْ عَلَيْكِ رُطَبًا جَنِيًّا فَكُلِيْ وَاشْرَبِيْ وَقَرِّيْ عَيْناً فَاِمَّا تَرَيِنَّ مِنَ الْبَشَرِ اَحَداً فَقُوْلِيْ اِنِّيْ نَذَرْتُ لِلرَّحْمٰنِ صَوْماً فَلَنْ اُكَلِّمَ الْيَوْمَ اِنْسِيًّا فَاَتَتْ بِهٖ قَوْمَهَا تَحْمِلُهٗ قَالُوْا يٰمَرْيَمُ لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا يٰاُخْتَ هٰرُوْنَ مَا كَانَ اَبُوْكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ اُمُّكِ بَغِيّاً فَاَشَارَتْ اِلَيْهِ قَالُوْا كَيْفَ نُكَلِّمُ مَنْ كَانَ فِي الْمَهْدِ صَبِيًّا قَالَ اِنِّيْ عَبْدُاللّٰهِ اٰتَانِيَ الْكِتَابَ وَجَعَلَنِيْ نَبِيًّا وَجَعَلَنِيْ مُبَارَكاً اَيْنَ مَا كُنْتُ وَاَوْصَانِيْ بِالصَّلٰوةِ وَالزَّكٰوةِ مَادُمْتُ حَيًّا وَبَرًّا بِوَالِدَتِيْ وَلَمْ يَجْعَلْنِيْ جَبَّارًا شَقِيًّا وَالسَّلَامُ عَلَيَّ يَوْمَ وُلِدْتُّ وَيَوْمَ اَمُوْتُ وَيَوْمَ اُبْعَثُ حَيًّا ذَالِكَ عِيْسَى بْنَ مَرْيَمَ قَوْلَ الْحَقِّ الَّذِيْ فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ مَا كَانَ اللّٰهُ اَنْ يَّتَّخِذَ مِنْ وَّلَدٍ سُبْحَانَهٗ اِذَا قَضٰى اَمْرًا اَنْ يَّقُوْلَ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ۔

(سورہ مریمؑ ۱۶-۳۵)

اور ذکر کرو کتاب میں مریمؑ کا، جب وہ علیٰحدہ ہوئیں اپنے کنبہ سے ایک مشرقی مکان میں، پھر انہوں نے ان لوگوں کی طرف سے پردہ کرلیا تو ہم نے بھیجا ان کی طرف اپنے (فرشتہ) روح کو جوان کے سامنے صورت انسان معتدل میں ہوگیا۔ مریمؑ نے کہا میں تجھ سے خدا کی پناہ مانگتی ہوں اگر تجھ کو خوف خدا ہے، اس نے کہا میں تمہارے پروردگار کا سفیر ہوں، تاکہ تمہیں ایک پاکیزہ بیٹا دوں۔ مریمؑ نے کہا: میرے بیٹا کیسے ہوسکتا ہے حالانکہ مجھے کسی انسان نے نہیں چھوا ہے اور نہ میں نے کبھی بدکاری کی، فرشتہ نے کہا کہ ہاں، ہے تو یوں ہی (مگر) تمہارے رب نے کہا ہے کہ یہ میرے لئے آسان ہے اور یہ بات اس غرض سے ہے کہ ہم اس کو نشانی قرار دیں لوگوں کے لئے اور رحمت اپنی طرف سے اور یہ امر مقرر شدہ ہے۔ پس حاملہ ہوگئیں مریمؑ اور گوشہ نشین ہوئیں ایک دور مقام پر۔ پھر دردزہ ان کو ایک درخت خرما کی جڑ میں لے گیا۔ مریمؑ نے کہا کاش میں اس سے پہلے مرگئی ہوتی اور نیست و نابود ہوجاتی۔ فرشتہ نے زیر درخت سے آواز دی کہ رنجیدہ نہ ہو، تمہارے رب نے تمہارے نیچے ایک چشمہ جاری کردیا ہے اور تم درخت خرما کو ہلاؤ، وہ تم پر تر و تازہ رطب گرائے گا۔ تم کھاؤ اور پیو اور خنکی چشم حاصل کرو۔ اگر کسی آدمی کو دیکھنا تو

اس سے کہنا کہ میں نے خدا کے واسطہ پر روزہ نذر کا رکھا ہے تو میں آج کسی سے بات نہ کروں گی۔ مریمؑ اپنے لڑکے کو اٹھائے ہوئے اپنی قوم کے پاس لائیں۔ انہوں نے کہا اے مریمؑ تم نے عجیب کام کیا ہے۔ اے ہارون کی بہن! نہ تمہارا باپ کوئی برا آدمی تھا اور نہ تمہاری ماں بدکار تھی۔ مریمؑ نے بچہ کی طرف اشارہ کیا۔ ان لوگوں نے کہا کیونکر بات کریں اس بچہ سے جو ابھی گہوارہ میں ہے۔ بچہ نے کہا کہ میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب عطا کی ہے اور مجھ کو نبیؑ قرار دیا اور بابرکت بنایا جہاں میں ہوں اور مجھ کو نماز روزہ کی ہدایت کی جب تک میں زندہ رہوں، اور مجھے اپنی ماں کے ساتھ نیک سلوک کرنے والا قرار دیا ہے، اور مجھے سرکش و بدبخت نہیں بنایا ہے، اور میرے لئے سلامتی ہے۔ جس دن میں پیدا ہوا اور جس دن مروں گا اور جس دن میں زندہ ہو کر اٹھوں گا۔ یہ ہے سچا قصہ عیسیٰؑ بن مریمؑ کا، جس میں لوگ شک کرتے ہیں۔ خدا کے لئے زیبا نہیں کہ اس کے کوئی بیٹا ہو۔ وہ اس سے بری ہے، جب وہ کسی کام کو کرنا چاہتا ہے تو کہہ دیتا ہے ہو جا اور وہ ہو جاتا ہے۔

ناظرین! یہ آیات کلام پاک کے اگر ذوق سلیم سے دیکھے جائیں تو ہر ہر آیت ان میں سے حضرت عیسیٰؑ کی ولادت نظام عادی کے خلاف ہونے پر ناطق ہے، لیکن ہم صرف ان آیات پر توجہ کرتے ہیں جن کو مدیر نگار نے بھی مفید مطلب سمجھ کے ان کے متعلق کلک آزمائی کی ہے۔

پہلا فقرہ **يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ اسْمُهُ الْمَسِيْحُ** درحقیقت اس آیت کا ترجمہ یہی ہے کہ خدا تمہیں بشارت دیتا ہے اپنے ایک کلمہ کی جس کا نام مسیحؑ ہے۔ اس کے معنی یقیناً یہی ہیں کہ خود حضرت مسیحؑ کو خدا کا کلمہ کہا گیا ہے۔ چنانچہ علامۂ نیشاپوری نے غرائب القرآن میں بھی آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔ ''بدرستیکہ خدا مژدہ دہد تورا بکلمہ ازو کہ نام او مسیح و عیسیٰؑ پسر مریمؑ است۔'' رہ گیا یہ امر کہ مسیحؑ کو کلمہ کس معنی سے کہا گیا ہے تو اس کے متعلق علامہ نیشاپوری رقمطراز ہیں:

ذالك ان عيسى لما خلق من غير واسطة اب صار تأثير كلمة كن فى حقه اظهر و اكمل فكان كانه نفس الكلمة كما ان من غلب عليه الجود والكرم والاقبال يقال انه محض الجود وصريح الاقبال۔

بات یہ ہے کہ عیسیٰؑ چونکہ بغیر کسی باپ کے واسطہ کے پیدا ہوئے تھے تو کلمۂ کن کی تاثیر ان کے بارے میں نمایاں تر اور کامل تر تھی تو گویا خود کلمہ خدا تھے، جیسے جس شخص میں جود و کرم و اقبال کا غلبہ ہو تو کہا جاتا ہے کہ وہ شخص مجسم جود و کرم و اقبال ہے۔

یہ ایک مسلم الثبوت مفسر کا کلام تھا اب لغویین میں علامہ مجد الدین فیروز آبادی کی تحقیق قاموس میں ملاحظہ ہو۔

عيسى كلمة الله لانه انتفع به وبكلامه اولانه كان بكلمة كن من غير اب۔

عیسیٰؑ کو کلمہ خدا اس جہت سے کہتے ہیں کہ ان سے اور ان کے کلام سے لوگوں کو نفع حاصل ہو۔ (جس طرح کلمہ مفید مطلب ہوتا ہے) یا اس وجہ سے کہ وہ بغیر کسی باپ کے صرف کلمہ کن سے پیدا ہوئے۔

بہر حال اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ کلمہ خود جناب عیسیٰؑ کو کہا گیا ہے۔ ہمارے مخاطب فرماتے ہیں اس کے یہ معنی ہو ہی نہیں سکتے کہ جس کلمہ کی خوشخبری دی جاتی ہے اس کا نام مسیحؑ ہوگا کیونکہ لفظ کلمہ مونث ہے اور اسمہٗ میں ضمیر مذکر کی ہے۔ اگر وہ مقصود ہوتا تو اسمہا ہونا چاہئے تھا۔''

یہ نحوی بحث اچھی چھیڑی ہے مگر افسوس کہ ابتدائی درسیات پر بھی نظر نہیں ہے ورنہ کافیہ کی عبارت ''**الكلمه لفظٌ وضع لمعنى مفرد** میں عدم مطابقت مبتداء و خبر کے اعتراض کو ملا جامی کا یوں دفع کرنا کہ ''کلمہ میں تائے وحدت ہے (نہ تائے تانیث) لہٰذا خبر کا مونث آنا ضروری نہیں'' آپ کی تسکین کے لئے کافی ہوتا اس محدود استعداد پر حقائق و دقائق قرآن سمجھنے کا دعویٰ کہاں تک موزوں ہے؟

رہا یہ امر کہ یہاں کلمہ کے معنی لفظ یا کلام کے نہیں ہیں بلکہ

مراد اس سے پیشین گوئی اور مخلوق ہے تو واضح رہے کہ کلمہ لفظ ہی کے معنی میں حقیقت ہے، جیسا کہ قاموس میں ہے **الکلمۃ لفظ**، اور پیشین گوئی یا مخلوق کسی لغت میں کلمہ کے معنی نہیں ہیں بلکہ جہاں جہاں اطلاق کلمہ کا مخلوق یا پیشین گوئی پر ہوا ہے مجاز ہے اور یہاں کوئی قرینہ معنی مجازی کے مراد ہونے کا پایا نہیں جاتا بلکہ کلمہ پیشین گوئی کے معنی میں قرار دے کر مفہوم آیت بھی ذوق سلیم کے بالکل خلاف ہوجاتا ہے آپ اس کا یوں ترجمہ کرتے ہیں کہ ''اللہ تجھے ایک بیٹے کی پیشین گوئی کی خوشخبری دیتا ہے جس کا نام مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ ہوگا'' چونکہ خوشخبری کا لفظ کسی آئندہ واقعہ کے لئے ہوتا ہے، لہٰذا آیت مذکورہ کا مفہوم بنا پر اس ترجمہ کے یہ نہیں ہوا کہ خدا بیٹے کی خوشخبری دیتا ہے جو درحقیقت مخاطب کا مطلوب ہے بلکہ بیٹے کی پیشین گوئی کی خوشخبری سے جیسا کہ مخاطب نے ترجمہ کیا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت پیشین گوئی کی خوشخبری ہے، پھر پیشین گوئی ہوگی اس کے بعد ولادت ہوگی لہٰذا یہ واضح کرنا آپ کے ذمہ ہے کہ یہ خوشخبری پیشین گوئی نہ تھی بلکہ پیشین گوئی اس کے بعد ہوئی۔

ہمارے مخاطب اپنے اس ترجمہ کو صحیح بنانے کے لئے لفظ ولد کو منہ کے بعد محذوف مانتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ محذوفات پُر کرنے کے بعد آیت یوں ہوگی۔

اِنَّ اللّٰہَ یُبَشِّرُکِ بِکَلِمَۃٍ مِّنۡہُ اسۡمُہُ الۡمَسِیۡحُ۔

الخ یعنی اللہ خوشخبری دیتا ہے تجھے اپنی طرف سے ایک پیشین گوئی کی اور پیشین گوئی ایک لڑکے کی ہے۔ جس کا نام مسیح عیسیٰؑ بن مریمؑ ہوگا۔ حالانکہ اگر کوئی دھوکہ کھانے والا اپنی سوء عقل سے اس تقدیر پر بفرض محال راضی بھی ہوجائے اور کلمہ کا پیشین گوئی کے معنی میں آنا مان بھی لیا جائے تو اس کا صلہ (ب) کے ساتھ ثابت نہیں اور دوسری آیت سورۂ نساء کی جس میں صاف صاف حضرت عیسیٰؑ کو کلمۃ اللہ کہا گیا ہے۔ وہ اس فرض کی ناپسندیدگی اور اس احتمال کو بالکل بے محل ثابت کرنے میں ضرورت سے زیادہ کافی ہے اور وہ یہ ہے۔

اِنَّمَا الۡمَسِیۡحُ عِیۡسَی ابۡنُ مَرۡیَمَ رَسُوۡلُ اللّٰہِ وَکَلِمَتُہٗۤ اَلۡقٰہَاۤ اِلٰی مَرۡیَمَ وَرُوۡحٌ مِّنۡہُ۔ (سورۂ انساء ۱۷۱/)

بس مسیح عیسیٰ بن مریمؑ خدا کے رسول اور اس کا وہ کلمہ ہیں جو اس نے مریمؑ کی طرف پہنچایا اور روح ہیں اس کی طرف سے۔

آیات سابقہ پر تفصیلی نظر

قَالَتۡ رَبِّ اَنّٰی یَکُوۡنُ لِیۡ وَلَدٌ وَّلَمۡ یَمۡسَسۡنِیۡ بَشَرٌ قَالَ کَذٰلِکِ اللّٰہُ یَخۡلُقُ مَا یَشَآءُ اِذَا قَضٰۤی اَمۡرًا فَاِنَّمَا یَقُوۡلُ لَہٗ کُنۡ فَیَکُوۡنُ۔ (سورۂ آل عمران آیت ۴۷/)

مریمؑ نے کہا اے پروردگار! میرا لڑکا کیسے ہوسکتا ہے درآں حالیکہ مجھے کسی مرد نے نہیں چھوا؟ کہا ہاں ہے تو یوں ہی، (مگر) اللہ پیدا کرتا ہے جو وہ چاہتا ہے۔ جب وہ کسی کام کا کرنا ٹھہرا لیتا ہے تو اس سے کہہ دیتا ہے ہوجا اور وہ ہوجاتا ہے۔

یقیناً مریمؑ کا حیرت ناک لہجہ میں کہنا کہ میرے یہاں فرزند کیوں کر ہوسکتا ہے حالانکہ مجھے اب تک کسی مرد نے ہاتھ نہیں لگایا، اس امر کی دلیل ہے کہ ان کے کوئی شوہر نہ تھا، اور اسی بات سے ان کو حیرت ہوئی کہ بغیر باپ کے اولاد کیوں کر ہوسکتی ہے جس پر روح القدس نے خلاق عالم کی قدرت کا عموم دکھلا کے مریمؑ کے استعجاب کو دفع کر دیا۔

مدیر نگار لکھتے ہیں کہ یہ ہوسکتا ہے کہ جس وقت مریمؑ کو بشارت دی گئی اس وقت تک ان کا نکاح نہ ہوا ہوگا اور اسی لئے انہوں نے کہا کہ مجھے اب تک مرد نے نہیں چھوا ہے لیکن بعد کو تعلق ازدواج قائم ہوا اور حضرت عیسیٰؑ پیدا ہوئے۔

[قسط ۱/ ختم ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ صفر ۱۳۴۵ھ، ستمبر ۱۹۲۶ء ص ۳۱/ تا ۳۶/]

اعجاز عیسوی

فرشتہ کی یہ ہدایت کہ کسی سے بات نہ کرنا یقیناً صرف اسی روز ولادت سے متعلق تھی کہ آج کسی سے بات نہ کرنا، یہ کہ ۱۲، ۱۳ سال تک کسی سے کلام نہ کرنا اور دلیل اس کی نصِ قرآن سے یہ ہے کہ:

لَنۡ اُکَلِّمَ الۡیَوۡمَ اِنۡسِیًّا۔ آج میں کسی سے بات نہ کروں گی۔

اس کے بعد جب حضرت مریمؑ کو لے کے قوم کی طرف آئیں اور انہوں نے طعنہ زنی شروع کی تو حضرت مریمؑ نے منہ سے بات نہیں بلکہ حضرت عیسیٰؑ کی طرف اشارہ کیا۔ یہ حضرت مریمؑ کا بات نہ کرنا اس فرشتہ کی ہدایت کے بعد کہ آج کسی انسان سے کلام نہ کرنا دلیل ہے اس کی کہ یہ واقعہ بھی روز ولادت ہی کا ہے۔

قوم کا یہ کہنا کہ ''لَقَدْ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا'' اس کے معنی آپ یہ کہتے ہیں کہ تم عجیب وغریب چیز لائی ہو، یعنی حضرت عیسیٰؑ کو جو ہمارے معتقدات کی توہین کرتے ہیں۔ اہل علم ناظرین یہ جہالت یا ابلہ فریبی ملاحظہ ہو کہ جِئْتِ شَيْئًا فَرِيًّا کا ترجمہ کیا جاتا ہے تم عجیب چیز لائی ہو جو کسی طرح درست نہیں ہوسکتا جئت مجی سے مشتق ہے، جس کے معنی آنے کے ہیں، نہ لانے کے۔ ہاں لانے کے معنی اس وقت پیدا ہوتے ہیں جب ب سے تعدیہ ہو۔ اگر جئت بشئی فری ہوتا تو مدیر نگار کا ترجمہ صحیح ہوتا لیکن یہاں جئت شیئاً فریاً ہے اس کی مثال یہ ہے کہ جاء بزید کے معنی ہیں زید کو لایا لیکن جاء زیدا کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ زید کے پاس آیا۔ بنابریں لفظی ترجمہ جئت شیئاً فریاً کا یہ ہوا کہ تم عجیب چیز کے پاس آئی ہو یعنی تم نے بہت برا اور حیرت انگیز کام کیا ہے اب تو سوائے اتہام زنا کے کوئی اور معنی نکل ہی نہیں سکتے۔ مدیر نگار نے صرف اس لئے کہ شیئاً فریاً لفظ حضرت عیسیٰؑ پر کھپ جائے ترجمہ میں تحریف کی ہے۔

دوسرے بات یہ ہے کہ اگر یہ معنی ہوں کہ تم عجیب فرزند لائی ہو جو ہمارے معتقدات کی توہین کرتا ہے تو اس کے ساتھ مَا كَانَ أَبُوكِ امْرَأَ سَوْءٍ وَّمَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا۔ (سورۂ مریم ۲۸ر) یعنی نہ تمہارا باپ برا آدمی تھا نہ تمہاری ماں زنا کار تھیں'' کا ضمیمہ بے جوڑ ہوجائے گا۔ پہلا باپ کے برا نہ ہونے، اور ماں کے زنا کار نہ ہونے سے تبلیغ توحید کو کون سا ربط؟'' مَا كَانَتْ أُمُّكِ بَغِيًّا۔ تمہاری ماں زنا کار نہیں'' کا فقرہ بتلاتا ہے کہ انہوں نے حضرت مریمؑ پر اسی قبیل کا الزام لگایا تھا، جب ہی تو کہا کہ نہ تمہارا باپ کوئی خراب شخص تھا نہ تمہاری ماں بدکار تھیں، پھر تم نے یہ کیسی بات کی؟

رہ گیا یہ امر کہ اگر وہ لوگ مریمؑ پر تہمت زنا ہی رکھتے ہوتے تو حضرت عیسیٰؑ کو جواب میں کچھ اس کے متعلق بیان کرنا چاہئے تھا، حالانکہ ان کے جواب میں اس کا اشارہ بھی نہیں ہے'' تو بات یہ ہے کہ اس سن وسال میں تکلم اور پھر اپنے اوصاف جلیلہ کا تذکرہ بھی ان کے زعم کے باطل ثابت کرنے میں کافی تھا کیونکہ اسی سے عیسیٰؑ کے مقرب الٰہی اور ایک خارق العادۃ اور مافوق طاقت بشریہ ہستی ہونے کا ان کو علم ہوگیا لہٰذا (معاذ اللہ) ولدالزنا ہونے کا خیال یہیں سے رفع ہوگیا۔

سورۂ آل عمران ومریمؑ کے ان آیات کے متعلق جن پر مدیر نگار نے خامہ فرسائی کی تھی کلام کر چکے اس کے علاوہ ایک آیت سورۂ نسا کی ہے۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ۔

(سورہ نساء ۱۷۱ر)

اے اہل کتاب! اپنے دین میں غلو نہ کرو اور اللہ کے متعلق سوائے سچ کے کوئی بات نہ کہو، مسیح بن مریمؑ اللہ کے رسول اور اس کا کلمہ ہیں، جو اس نے مریمؑ کی طرف پہنچایا، اور اس کی طرف سے روح ہیں۔

دوسری آیت سورۂ انبیاؑ کی۔

الَّتِي أَحْصَنَتْ فَرْجَهَا فَنَفَخْنَا فِيهَا مِن رُّوحِنَا وَجَعَلْنَاهَا وَابْنَهَا آيَةً لِّلْعَالَمِينَ۔ (سورہ انبیاء ۹۱ر)

اور مریمؑ وہ ہے جس نے اپنی عصمت کی حفاظت کی تو پھونک دی ہم نے اس میں روح اپنی اور بنادیا ہم نے اس کو اور اس کے بیٹے کو نشانی عالمین کے لئے۔

پہلی آیت میں حضرت عیسیٰؑ کو کلمۂ خدا کہا گیا ہے اور کلمہ کی تحقیق ہم سابق میں کر چکے ہیں کہ حضرت عیسیٰؑ کو کلمہ خدا اس جہت سے کہا گیا ہے کہ ان میں کلمۂ کن کی تاثیر اظہر واتم تھی۔

دوسری آیت میں کئی لفظیں محلِ استدلال ہیں، ایک الَّتِي

اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا دامن مسِ ہر شوہر سے بری تھا۔ دوسرے نفخ روح کا تذکرہ جَعَلۡنَا هَا وَابۡنَهَا آيَةً لِّلۡعَالَمِيۡن ہم نے مریمؑ اوران کے بیٹے کو ایک آیت اپنی قرار دیا عالمین کے لئے۔ اگر مریمؑ اور عیسیٰؑ کو آیت اس معنی سے کہا گیا ہے کہ وہ خالق وصل کی دلیل ہیں تو ہر انسان بلکہ ہر مخلوق اس جہت سے آیت ہے، کوئی خصوصیت نہیں ہوگی۔ معلوم ہوا کہ ان کو آیت اس حیثیت سے کہا گیا ہے کہ ان میں قدرت خدا کے آثار بہت قوت کے ساتھ رونما ہوئے۔ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق تو یہ کہا جا سکتا ہے کہ ان کو آئندہ زندگی اور رسالت ونبوت کی حیثیت سے آیت خدا کہا گیا ہے، جیسا کہ اس کے متعلق مدیر نگار نے آیات سورۂ مریمؑ پر کلک آزمائی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لِنَجۡعَلَهٗۤ اٰيَةً لِّلنَّاسِ وَرَحۡمَةً مِّنَّا (سورۂ مریم ۲۱/) کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں، لیکن ان کا تعلق حضرت عیسیٰؑ کی آئندہ زندگی اور نبوت سے ہے، نہ کہ ولادت اور طریق ولادت سے۔''

مگر ہم پوچھنا چاہتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کو کس حیثیت سے آیت خدا کہا گیا ہے یقیناً اس کا باعث یہی ہے کہ ان کے یہاں حضرت عیسیٰؑ کی ولادت چونکہ نظام عادی کے بالکل خلاف اور قدرت کاملہ خداوند عالم کا مظہر تھی، لہٰذا ماں بیٹے دونوں کو آیت خدا کہا گیا ہے۔

مدیر نگار نے ان سب باتوں سے قطع نظر کرتے ہوئے صرف نفخ روح کی لفظ پر عنان قلم کو منعطف کیا اور وہ لکھتے ہیں کہ۔۔۔ یہ استدلال حد درجہ ضعیف ہے کیونکہ خدا نے ہر انسان کی پیدائش کا باعث نفخ روح قرار دیا۔ خَلَقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ ثُمَّ جَعَلَ نَسۡلَهٗ مِنۡ سُلٰلَةٍ مِّنۡ مَّآءٍ مَّهِيۡنٍ ثُمَّ سَوّٰهُ وَنَفَخَ فِيۡهِ مِنۡ رُّوۡحِهٖ (سورہ سجدہ ۷،۸) میری سمجھ میں نہیں آتا کہ الفاظ قرآن سے چشم پوشی درحقیقت جہل ہے یا تجاہل؟ خَلَقَ الۡاِنۡسَانِ مِنۡ طِيۡنٍ الخ میں انسان سے مراد حضرت آدمؑ ہیں چنانچہ الف لام عہد اسی جہت سے داخل ہیں اور انہیں کے متعلق نفخ روح کا لفظ ارشاد ہوتا ہے۔ لہٰذا مقصود کے مضر نہیں۔

آپ اَحۡصَنَتۡ فَرۡجَهَا کی لفظ کو اپنے مؤید بناتے ہیں بایں عنوان کہ محصنہ شوہر دار عورت کو کہتے ہیں کنواری عورت کو عربی زبان میں محصنہ نہیں کہتے۔ لیکن یہ آپ کی غلط فہمی اور لغت عرب سے نابلدی ہے۔ اَحۡصَنَتۡ جب لازم مستعمل ہو تو اس کے معنی عفت اور تزوجت کے آتے ہیں اوران میں سے ہر ایک مستقل ہے یعنی عفت ایک واحد معنی ہے جس میں تزوج کی شرط نہیں ہے اور تزوجت ایک مستقل مفاد ہے۔ مگر یہاں تو لازم نہیں استعمال ہوا ہے بلکہ فَرۡجَهَا اس کا مفعول موجود ہے۔ اب صرف اس کے معنی حفظت کے ہو سکتے ہیں اور چونکہ صلہ اس کا کوئی مذکور نہیں ہے کہ کس سے حفاظت کی، لہٰذا اس میں عموم پیدا رہے گا کہ ان کا دامن ہر مرد سے محفوظ رہا اور یہی ہمارا مطلوب ہے۔

مدیر نگار بار بار یہی لکھتے ہیں کہ حضرت مریمؑ کا تعلق ازدواج یوسف نجار کے ساتھ قائم تھا مگر یہ بالکل ہی غیر مسلم ہے۔ جو کچھ مفسرین نے تصریح کی ہے وہ یہ ہے کہ حضرت مریمؑ یوسف نجار کی منگیتر اور ان کی طرف منسوب تھیں مگر عقد ہو چکا تھا یہ کہیں سے ثابت نہیں۔ چنانچہ علامہ ثعلبی لکھتے ہیں کہ سب سے پہلے جناب مریمؑ کے حمل کا علم یوسف نجار کو ہوا، جو حضرت مریمؑ کے ابن عم تھے اور حضرت مریمؑ ان کے ساتھ منسوب تھیں اور یہ دونوں مسجد کی خدمت کیا کرتے تھے اور اہل زمانہ میں ان دونوں کا عفت وصلاح میں مثل نہ تھا۔ یوسف نے مریمؑ سے کہا کہ میرے دل میں تمہارے متعلق ایک بات آئی ہے، نہیں چاہتا کہ اس کو تم سے چھپاؤں۔ مریمؑ نے کہا جو کہنا ہو کہو۔ یوسفؑ نے کہا کہ اے مریمؑ! تم مجھ کو بتلاؤ کہ کوئی زراعت بغیر تخم روئیدہ ہوئی ہے؟ مریمؑ نے کہا کہ ہاں کیوں نہیں، جب شروع شروع خلقت زراعت خدا نے کی ہے تو بے تخم ہی روئیدہ کی تھی۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ وہ بغیر پانی سے مدد لئے ہوئے روئیدہ کرنے پر قادر نہیں ہے۔ تمہیں نہیں معلوم کہ خدا نے آدمؑ وحوّا کو بغیر مرد وعورت کے پیدا کیا تھا۔ یوسفؑ نے کہا میرا یہ مطلب نہیں ہے میرا تو یہ مطلب ہے کہ خدا ہر بات پر قادر ہے اس کے بعد یوسفؑ کے

دل سے شبہ مٹ گیا۔

رہی یہ آیت کہ لَنْ یَّسْتَنْکِفَ الْمَسِیْحُ اَنْ یَّکُوْنَ عَبْدًا لِلّٰہِ (سورہ نساء ۱۷۲/) تو اس سے اس شخص کی رد ہو سکتی ہے۔ جو مسیحؑ کی الوہیت کا قائل ہو اور عبودیت میں قدح کرے۔ نظام عادی کے خلاف ولادت کا ہونا عبودیت کے منافی نہیں بلکہ خالق کے کمال قدرت کی دلیل ہے۔

اس کے علاوہ مدیر نگار اپنے مطلب کے اثبات میں اس امر کو پیش کرتے ہیں کہ ''سورۂ انعام میں حضرت عیسیٰؑ کا اولاد ابراہیمؑ سے ہونا بتایا گیا ہے۔ اگر ان کے باپ یوسف نجار نہ ہوں تو وہ اولاد ابراہیمؑ میں کیوں کر مندرج ہوں گے۔'' یہ استدلال بالکل بادر ہوا ہے۔ قرآن مجید میں صاف صاف حضرت مریمؑ کے والد کا نام عمران بتایا گیا ہے۔ جن کو مفسرین ماثان کی اولاد میں لکھتے ہیں اور ان کے واسطے سے نسب حضرت ابراہیمؑ تک پہنچتا ہے۔ لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کا ماں کے واسطہ سے اولاد ابراہیمؑ میں شمار کیا گیا ہے۔ مدیر نگار کہتے ہیں کہ ''مریمؑ کو بنت عمران کہنا یہ معنی نہیں رکھتا کہ وہ واقعی عمران کی بیٹی تھیں بلکہ اس سے مقصود یہ ظاہر کرنا ہے کہ وہ آل عمران میں سے تھیں۔ جن کی بزرگی کے متعلق کلام مجید میں یہ آیت آئی ہے۔ اِنَّ اللّٰہَ اصْطَفٰٓی اٰدَمَ وَنُوْحًا وَّ اٰلَ اِبْرٰھِیْمَ وَ اٰلَ عِمْرٰنَ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ۔'' (سورہ آل عمران ۳۳/)

پہلا جواب تو یہ ہے کہ اچھا حقیقی بیٹی عمران بن ماثان کے نہ سہی مگر آل عمران سے ہونا تو قرآن سے ثابت ہے اور ظاہر ہے کہ آل عمران بنی اسرائیل سے ہیں لہٰذا یہیں سے اولاد ابراہیمؑ میں سے ہونا ثابت ہو گیا۔

اس کے علاوہ یہ خیال کہ بنت کے معنی حقیقی دختر کے نہیں ہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ وہ آل عمران میں سے تھیں۔ دوسری آیت سورہ آل عمران کی دیکھنے کے بعد بالکل ہباء منثورا ہو جاتا ہے اور وہ آیت یہ ہے۔

اِذْ قَالَتِ امْرَاَتُ عِمْرٰنَ رَبِّ اِنِّیْ نَذَرْتُ لَکَ مَا فِیْ بَطْنِیْ مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ فَلَمَّا وَضَعَتْھَا قَالَتْ رَبِّ اِنِّیْ وَضَعْتُھَآ اُنْثٰی وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَیْسَ الذَّکَرُ کَالْاُنْثٰی وَاِنِّیْ سَمَّیْتُھَا مَرْیَمَ وَاِنِّیْٓ اُعِیْذُھَا بِکَ وَذُرِّیَّتَھَا مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ (سورہ آل عمران ۳۵،۳۶)

جب کہا عمران کی بیوی نے کہ بارالٰہا! میں تیرے لئے نذر کرتی ہوں کہ اس بچہ کو جو میرے شکم میں ہے محرر بناؤں گی تو مجھ سے قبول کرنا کیونکہ تو ہی تو سمیع و علیم ہے۔ جب وضع حمل ہوا تو انہوں نے کہا کہ خداوندا! مولود لڑکی ہے اور خدا جانتا ہے کہ کیا پیدا ہوا ہے اور عورت و مرد یکساں نہیں ہوتے اور میں نے اس کا نام مریمؑ رکھا ہے اور میں اس کو اور اس کی اولاد کو شیطان کے ضرر سے تیری پناہ میں دیتی ہوں۔

مادر مریمؑ کو امرأۃ عمران یعنی عمران کی بیوی کہا گیا ہے۔ اس کے بعد مدیر نگار کا یہ کہنا کہ مریمؑ بنت عمران کے معنی عمران کی بیٹی نہیں ہیں قابل ہزار ستائش و ثنا ہے۔ این کار از تو آید ومرداں چنیں کنند۔ آپ کا یہ کہنا کہ ''معاملہ'' مرداں چنیں کنند'' سے متعلق نہیں ہے بلکہ یزداں چنیں کنند'' سے وابستہ ہے'' اسی بنا پر درست ہے کہ خالق افعال عباد (خیر و شر) جناب باری قرار دیا جائے۔ نعوذ باللہ من ھذہ لھفوات۔

[ماخوذ از ماہنامہ الواعظ، لکھنؤ شعبان ۱۳۴۵ھ/ مارچ ۱۹۲۷ء ص ۳۰/ تا ۳۴/]

اعجاز عیسوی

دوسرا باب

حیات حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام

حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کے متعلق مدیر نگار بھوپال نے جو خامہ فرسائی کی ہے اس میں پہلا حصہ حضرت کی ولادت کے متعلق تھا جس کو ہم نے اپنے سابق مضمون میں بالکل واضح کر دیا اور معلوم ہو گیا کہ یقیناً قرآن مجید حضرت عیسیٰؑ کی ولادت بغیر کسی باپ کے بتلاتا ہے اور اس کا انکار انکار قرآن ہے۔

جب یہ حصہ مدیر نگار کا بالکل نقش برآب ہو گیا تو نظر ناقد

حصہ دوم کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مدیر نگار نے جو کچھ اس حصہ میں لکھا ہے وہ بھی قرآن وحدیث سے بے خبری یا کنارہ کشی پر دلالت کرتا ہے۔

حضرت عیسیٰؑ کی حیات وموت کا مسئلہ مختلف مذاہب عالم کی حیثیت سے مختلف فیہ سہی مگر اسلامی نقطۂ نظر سے متفق علیہ ہے، یہودیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سولی دے کر مار ڈالے گئے، عیسائیوں کا عقیدہ ہے کہ انہیں سولی دی گئی مگر خدا نے دوبارہ زندہ کرکے آسمان پر بلا لیا۔ اسلام نے ان دونوں عقیدوں کی رد کی اور کتاب ربانی نے صاف صاف وَمَا قَتَلُوْهُ کہہ کے پہلے قول کی اور وَمَا صَلَبُوْهُ کہہ لے دوسرے قول کی تکذیب کردی اور درحقیقت یہ دونوں وہ لفظیں ہیں جن کے بعد کسی غلط فہمی کی مسئلہ میں گنجائش نہیں ہے۔

مسلمانوں کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو نہ سولی دی گئی اور نہ ان کی موت واقع ہوئی بلکہ سولی کسی اور شخص کو دھوکہ سے دی گئی اور حضرت عیسیٰؑ کو خداوند عالم نے زندہ آسمان پر اٹھا لیا اور اب تک زندہ ہیں اور قبل روز قیامت آسمان سے زمین پر اتریں گے اور دجال کو قتل کریں گے۔

یہی خیال وہ ہے جس پر تمام اسلامی تفاسیر واحادیث و اخبار وتواریخ متفق ہیں۔ اسلامی عقیدہ کا یہود ونصاریٰ کے علاوہ تیسرا مخالف قادیانی فرقہ ہے جو بارہویں صدی ہجری کے اواخر میں موضع قادیان پنجاب سے نمودار ہوا اور اس نے اس لئے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے مسیح موعود ہونے میں کوئی کسر نہ رہ جائے حضرت عیسیٰؑ پر ہاتھ صاف کردیا اور کہا کہ ان کا انتقال ہوگیا ہے، سری نگر، کشمیر میں قبر بھی موجود ہے۔

ہمارے مخاطب مدیر نگار بھی اس نقطۂ خیال میں قادیانی جماعت کے ہم مشرب ہیں اور حیات حضرت عیسیٰؑ علیہ السلام کا انکار کرتے ہوئے ان کو مردہ سمجھتے ہیں اور ان کا خیال ہے کہ عیسیٰؑ نے عمر طبیعی تک پہنچ کے اپنی موت سے انتقال کیا۔

چونکہ اس بحث میں ہمارا نقطۂ نظر صرف مدیر نگار تک محدود نہیں رہ سکتا بلکہ فطرتاً قادیان کا ایک پورا فرقہ ہمارے مقابل آجاتا ہے لہٰذا ہم اس پر ذرا تفصیل سے بحث کرنا چاہتے ہیں کیونکہ قادیان کے مرزا غلام احمد صاحب کی نبوت ومسیحیت کی نیو اسی بنیاد پر قائم ہے۔

انکار حیات کے وجوہ

عموماً قادیانیوں کی طرف سے جو وجوہ انکار حیات حضرت عیسیٰؑ کے پیش کئے جاتے ہیں وہ دو ہیں۔ (۱) طول عمر کا استبعاد (۲) آیات قرآن کو غلط معانی پہنا کر ان سے موت پر استدلال۔ مدیر نگار نے ان دونوں امروں کے علاوہ ایک تیسری وجہ کا اضافہ کیا ہے اور وہ انجیل کے روایات سے استدلال ہے۔ ہم ان تینوں وجہوں کو بترتیب ذکر کرکے ان کی حقیقت کو واضح کرتے ہیں۔

پہلی وجہ

احمدی جماعت کی طرف سے عموماً حیات عیسیٰؑ علیہ السلام کے متعلق یہ شبہ کیا جاتا ہے کی کسی شخص کا اتنے عرصہ تک زندہ رہنا ممکن نہیں لہٰذا حیات عیسیٰؑ کا اعتقاد غلط ہے، ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ دعوائے باطل کے پرستار اپنی دروغ بانی میں عقل سے کیوں کام نہیں لیتے۔ عالم کا ہر مفہوم وجود کی طرف نسبت رکھنے کے بعد تین صورتوں سے خالی نہیں ہوسکتا، واجب، ممتنع، ممکن، ممتنع وہ شئے ہے جس کی ذات کو عدم سے ایک خصوصیت خاصہ حاصل ہے جس کی وجہ سے عقل اس کی طرف انتساب وجود کو محال سمجھتی ہے جیسے سیاہی وسفیدی یا وجود وعدم کا ایک محل پر مجتمع ہونا یا شریک باری، یہ چیزیں ایسی ہیں جن کے وجود کو عقل تجویز نہیں کرسکتی۔ اس کے مقابل میں واجب وہ ہے کہ جس کی ذات وجود سے خصوصیت خاصہ رکھتی ہے اور عقل انتساب عدم کو اس کی طرف تجویز نہیں کرسکتی۔ ان دونوں کی درمیانی چیز ممکن کہی جاتی ہے، یعنی نہ جس کی ذات کو عدم سے خصوصیت ہے نہ وجود سے، بلکہ نسبتِ عدم و وجود اس کی طرف برابر ہے، لہٰذا عقل اس کے وجود کو بھی تجویز کرسکتی ہے اور عدم کو بھی۔ ممکنات اپنے وجود میں کسی نہ کسی مؤثر اور فاعل کے محتاج ہیں کیونکہ جب ان کی طرف

وجود وعدم کی یکساں نسبت ہے تو ایک ان میں سے دوسرے پر غالب جبھی آسکتا ہے کہ جب خارجی تقویت ان میں سے کسی ایک جنبہ کو ہو اور اسی دلیل سے ہم عالم کی خلقت کے لئے ایک واجب الوجود ہستی کے ماننے پر مجبور ہوئے ہیں جس کو باری تعالیٰ کہتے ہیں۔

ممکن جب اپنے وجود میں مؤثر کا محتاج ہوا تو اس کی تاثیر کا تابع ہے جس طرح تاثیر اس سے متعلق ہوگی اسی طرح اس کا وجود ہوگا۔ اس میں عقل کو کوئی دخل و مزاحمت نہیں ہے۔ منتہا یہ ہے کہ جناب باری، کہ جو مؤثر عالم ہے، اس نے بعض اشیاء میں تاثیر کو ایک نہج خاص پر جاری اور اسباب خاصہ پر مبنی کر دیا ہے۔ مثلاً دن کا وجود طلوع آفتاب کے ساتھ اور اس کا بارہ گھنٹہ میں اپنے دائرہ نہاری کو ختم کرنا اور چاند کا شب کو طالع ہونا اور ستاروں کی رفتار کا ایک مرتب نظام کے تحت میں جاری رہنا اسی کو ہم نظام عادی کہتے ہیں اور جو چیزیں اس کے خلاف ہوں انہیں محال عادی یا خارق عادت سے تعبیر کرتے ہیں۔

محال عقلی کسی وقت میں وجود کو قبول نہیں کر سکتا اور اگر ایسا ہو جائے تو وہ محال نہیں، مگر نظام عادی کی مخالفت مؤثر کی تاثیر متعلق ہونے پر ممکن ہے اس لئے خود وہ نظام مؤثر کی تاثیر کا تابع ہے۔ جس نے اس کو قائم کیا وہی کسی خاص مصلحت سے اس میں تغیر دینے پر بھی قادر ہے۔ لہٰذا محال عادی کے عدم وقوع کو کوئی عقلی ہدایت یا نظریہ ثابت کرنے سے قاصر ہے اور معجزات انبیاؑ کا تعلق ہمیشہ اسی قسم سے ہوا کرتا ہے کہ جو محال عادی کہی جاتی ہے ورنہ محال عقلی کسی حیثیت سے وجود کی قابلیت نہیں رکھتا۔ کسی چیز کا ہمیشہ ایک نہج پر ہونا یا نہ ہونا اس کے ضروری یا محال ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا ورنہ قضایا میں دوام وضرورت مرادف لفظیں ہوتیں یا نسبت تساوی کی ہوتی۔ اس کو اہل معقول بخوبی سمجھ سکتے ہیں۔ ہاں دیکھنا یہ چاہئے کہ شئے جس طریق پر جاری ہے اس کے خلاف کوئی عقلی استحالہ ہے یا نہیں۔ اگر عقلی کوئی استحالہ ہے تو اسے محال سمجھنا چاہئے ورنہ ممکن۔ اسی بنا پر شیخ الرئیس بوعلی سینا کا مقولہ ہے **کل ماقرع سمعك من العجائب والغرائب فذره فی بقعة الامكان حتی یذودك عنه قطعی من البرهان**۔ یعنی جو عجائب وغرائب تمہارے گوش زد ہوں انہیں امکانی دائرہ میں رکھو، جب تک کہ کوئی یقینی دلیل اسے مانع نہ ہو۔ معجزہ سے قطع نظر کیا جائے تو دنیا میں مختلف اوقات سیکڑوں امور خلاف عادت ہوتے رہتے ہیں۔ معمولاً ایک بطن مادر سے ایک بچہ متولد ہوتا ہے مگر عالم میں توامین کے وجود سے انکار نہیں ہو سکتا فصول میں تغیر وتبدل ایک نظم خاص کے ماتحت ہے مگر کبھی اس کے خلاف رونما ہو کے قحط سالی کی صورت پیدا ہوتی ہے اس کی نظیریں روزانہ مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں۔ ایسی صورت میں نظام عادی کے خلاف کوئی امر منکر اس کی تکذیب پر آمادہ ہو جانا کہاں تک بامحل ہے۔

اثر اگر علۃ موجبہ (قہریہ غیر اختیاریہ) سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا ایک نہج خاص پر ہونا ضروری ہے اسی وجہ سے ہم مادہ کو صانع عالم ماننے والوں پر اعتراض کرتے ہیں کہ مقتضی طبیعۃ واحدہ کا بدلتا نہیں اور مادہ شعور وادراک نہیں رکھتا لہٰذا جتنے آثار اس کے ہوں گے وہ قہری (جیسے آگ کا کام جلانا) ایسی صورت میں اختلاف صور وطبائع واشکال و ماہیات کیسا؟ لیکن اگر مؤثر علۃ مختار ہو تو معلول اس کے وجود کا تابع نہیں بلکہ مشیت و ارادوں کا تابع ہے جس طرح اس کے وجود سے مشیت متعلق ہوگی ویسا وجود ہوگا۔ اس کا ہم اپنے افعال اختیاریہ واضطراریہ سے اندازہ کر سکتے ہیں۔ منتہا یہ کہ مشیت وارادوں کی وسعت حدود قدرت واختیار کے دائرہ سے تعلق رکھتی ہے اگر قدرت ناقص ہے تو مشیت وارادوں کا تعلق محدود دائرہ میں محصور ہونا ضروری ہے۔ لیکن اگر قدرت کامل اور عام ہے تو مشیت و ارادوں کا عموم کسی حد پر رک نہیں سکتا یہ اور بات ہے کہ عقلی محالات اپنی ذاتی ناقابلیتی کی وجہ سے اس دائرہ سے خارج ہو جائیں لیکن ان کے علاوہ دیگر اشیاء دائرہ تعلق قدرت کے اندر ہیں اور ان سے مشیت وارادوں کا تعلق ممکن ہے، خواہ نظام عادی

اس کے خلاف جاری ہو۔

موجودات میں خود ہم دیکھتے ہیں کہ وہ مختلف قسموں پر ہیں۔ بعض ایسے ہیں کہ ان کا وجود آنی ہے اور دو تین آن میں موجود ہو کے فنا ہو جاتے ہیں ان کی عمر طبیعی یہی ہے اگر اس کی مثال دیکھنا ہو تو کسی وقت صاف چشمہ کے کنارے جا بیٹھو اور دیکھو کہ ایک سیکنڈ میں کتنے حباب موجود ہو کے فنا ہو جاتے ہیں اسی طرح آگ سے اڑتے ہوئے شرر اور پتھر سے نکلتی ہوئی چنگاریاں، ان موجودات کو قدرت کی طرف سے بہت مختصر عمر عطا ہوئی ہے، بعض موجودات ایسے ہیں جن کا وجود چند گھنٹوں کا شرمندۂ احسان ہے جیسے دنبالہ دار ستارے جو آسمان پر نمودار ہوتے اور چند گھنٹہ موجود رہ کے معدوم ہو جاتے ہیں۔ اسی طرح بعض کا وجود چند روزہ اور بعض چیزیں سالہا سال موجود رہنے کی قابلیت رکھتی ہیں۔ نباتات میں زراعت چند ماہ کی عمر رکھتی ہے۔ چند ماہ کے بعد فنا ہو جاتی ہے اور درخت بعض سالہا سال قائم رہتے ہیں اور صدہا سال فائدہ پہنچاتے ہیں۔

یہ مراتب عمر کے یونہی تفاوت کے ساتھ بڑھتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارا نقطۂ نگاہ بعض ایسے موجودات پر پہنچتا ہے کہ جن کی بقا ہزارہا سال سے ہے اور معلوم نہیں کب تک باقی رہیں گے۔

چاند سورج، آسمان و زمین، یہ چیزیں ایسی ہیں جن کی ابتدائے خلقت تک ہمارا علم نہیں پہنچتا کہ کب ہوئے اور انتہائے عمر کا بھی کچھ پتہ نہیں۔ اسی وجہ سے بعض تنگ خیال افراد ان کو قدیم اور ناقابل فنا سمجھنے لگے، حالانکہ ان کے حرکات و تغیرات ان کے حدوث کی بہت بڑی دلیل ہیں۔

ایک نوع کی چیزوں میں ہمارا مشاہدہ اختلاف عمر کا پتہ دیتا ہے۔ درختوں میں چھوئی موئی کی عمر اتنی محدود ہے کہ ادھر ہاتھ اس کے دامن تک پہنچا اور وہ فنا ہو گیا، برخلاف اس کے بعض درخت صدہا سال قائم رہتے ہیں۔ خود بنی آدم میں عمر کا اختلاف روزانہ ہماری نظر کے سامنے آتا رہتا ہے۔ ایک بچہ پیدا ہوتا ہے اور چند ساعتیں بھی نہیں گذرتیں کہ وہ دنیا کو خیرباد کہہ کے رخصت ہو جاتا ہے اور دوسرا شخص ستر، اسی برس کی عمر تک پہنچتا ہے اور اسی عالم میں تاریخیں شاہد ہیں کہ بعض افراد نے ۹۰۰ اور ہزار برس تک کی عمر پائی ہے۔

تمام موجودات کا یہ اختلاف دلیل ہے اس کی کہ ان کے صانع کا دائرہ قدرت و اختیار محدود نہیں ہے بلکہ جس شئے سے جس طرح چاہتا ہے اس کا ارادہ متعلق ہوتا ہے اور وہ اسی طرح موجود ہوتی ہے جب ان مشاہدات کے دیکھنے سے یہ نظریہ بالکل بے نقاب ہو جاتا ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ کسی شخص کے طول عمر میں استبعاد کیا جائے اور اسی استبعاد کی بنا پر اس کی تکذیب پر جرأت کی جائے۔ قرآن مجید میں ابلیس کے متعلق صاف صاف قیامت تک زندہ رہنے کی تصریح کی ہے۔

قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِیْٓ اِلٰی یَوْمِ یُبْعَثُوْنَ قَالَ فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ۔

(سورہ ص ۷۹، ۸۱)

ابلیس نے کہا کہ خداوندا مجھے روز قیامت تک کا موقع دے۔ ارشاد باری ہوا کہ اچھا تو روز معین (قیامت) تک زندہ رکھے جانے والوں میں سے ہے۔

اِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ یعنی تو منظرین میں سے ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ قیامت تک زندہ رہنے والے متعدد اشخاص ہیں جن میں ایک ابلیس ہے۔

قرآن پر ایمان لانے والا شخص صرف وہمی استبعادات سے جو کسی عقلی فیصلہ سے تعلق نہیں رکھتے ایسے امور کی رد نہیں کر سکتا۔

دوسری وجہ

آیات قرآن سے استدلال

بعد اس کے ہم مخالفین کی وجہ اول کو بالکل نیست و نابود کر چکے تو دوسری وجہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ عموماً قادیانیوں کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کی موت پر جن آیات قرآن سے استدلال کیا جاتا ہے وہ سب حسب ذیل ہیں۔

پہلی آیت:۔ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ

وَرَافِعُكَ اِلَيَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْ۔

[سورۂ آل عمران ۵۵]

جب کہ کہا خداوند عالم نے کہ اے عیسیٰؑ میں تمہارے زمانہ کو پورا کرنے والا اور تمہیں اپنی طرف بلند کرنے والا اور تمہیں کفار (کی نجاست) سے جدا کرنے والا ہوں۔

دوسری آیت:۔ وَاِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُوْنِيْ وَاُمِّيَ اِلٰهَيْنِ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُوْنُ لِيْ اَنْ اَقُوْلَ مَا لَيْسَ لِيْ بِحَقٍّ اِنْ كُنْتُ قُلْتُهٗ فَقَدْ عَلِمْتَهٗ تَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِيْ وَلَا اَعْلَمُ مَا فِيْ نَفْسِكَ اِنَّكَ اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ مَا قُلْتُ لَهُمْ اِلَّا مَا اَمَرْتَنِيْ بِهٖ اَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبَّكُمْ وَ كُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا مَا دُمْتُ فِيْهِمْ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ وَاَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ۔ (سورۂ مائدہ ۱۱۶، ۱۱۷)

جب کہے گا اللہ (قیامت کے دن) اے عیسیٰؑ فرزند مریمؑ کیا تم نے کہا تھا لوگوں سے کہ اللہ کو چھوڑ کے مجھ کو اور میری ماں کو خدا ٹھہراو۔ عیسیٰؑ کہیں گے کہ پاک ہے، تیری ذات، مجھے حق نہ تھا کہ میں وہ بات کہتا جو میرے لئے درست نہ تھی اگر میں نے کہا تھا تو تو جانتا ہوگا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے۔ اور جو تیری مشیت میں ہے وہ میں نہیں جانتا تو غیب کی باتوں کا بڑا جاننے والا ہے میں نے تو ان سے وہی کہا جس پر تو نے مجھے معمور کیا تھا کہ خدا کی پرستش وعبادت کرو جو میرا اور تمہارا سب کا پروردگار ہے اور میں ان پر گواہ تھا جب تک کہ میں ان کے اندر تھا جب میرے زمانے کو تو نے پورا کیا تو تو ان کا نگراں تھا اور تو ہر چیز کا دیکھنے والا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں **مُتَوَفِّيْكَ** اور **تَوَفَّيْتَنِيْ** کی لفظ ہے جس کے معنی وفات بمعنی موت سمجھے جاتے ہیں چنانچہ مدیر نگار **يَا عِيْسٰى اِنِّيْ مُتَوَفِّيْكَ** کا ترجمہ کرتے ہیں کہ "اے عیسیٰؑ میں بے شک تجھے مارنے والا ہوں اور **فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ** کے معنی لکھتے ہیں کہ "پھر جب تو نے مجھ پر موت طاری کی" حالانکہ یہ خیال بالکل لغت عرب سے نابلدی کی دلیل ہے۔

بعض ارباب لغت کا خیال تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ کہ **توفی** مشترک لفظ ہے اور اس کے کئی معنی ہیں۔ (۱) نوم (۲) موت (۳) قبض (۴) پورا کرنا (۵) چھڑا دینا (۶) مدت کا پورا کر دینا۔ لیکن جہاں تک ہمارا ناقص تتبع مساعدت کرتا ہے یہ معلوم ہوتا ہے کہ درحقیقت **توفی** کے واحد معنی پورا کرنے کے ہیں، اور جتنے معنی ہیں وہ اسی مناسبت سے مراد لئے جاتے ہیں، موت کو وفات سے اسی جہت سے تعبیر کرتے ہیں کہ موت کے آنے پر عمر پوری ہوتی ہے اور مدت حیات کا کمال ہوتا ہے، اسی طرح نوم بھی اسی جہت سے **توفی** ہے کہ اس کی وجہ سے قلم تکلیف کی روانی موقوف ہوتی ہے اور بیداری کا نامہ عمل وہاں پر ختم ہوتا ہے قبض میں ان ہی معنی سے مستعمل ہے۔ مثلاً **توفّیت مالی** یعنی پورا مال اپنا میں نے لے لیا مختصر جتنے معنی ہیں وہ سب اسی معنی کی مناسبت سے ہیں ورنہ لفظ **توفی** ان میں سے کسی معنی پر دلالت نہیں کرتا۔

یہ خیال کہ وفات وموت مرادف لفظیں ہیں بالکل غلط ہے۔ قرآن مجید کے آیات پر نظر کرنے والا اس خیال کی رکاکت کو سمجھ سکتا ہے۔ قرآن میں جس طرح موت کے معنی میں توفی کا استعمال ہوا ہے اسی طرح نوم کے معنی میں بھی یہ لفظ لایا گیا ہے۔ ملاحظہ ہو:

هُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰىكُمْ بِاللَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰى اَجَلٌ مُّسَمًّى۔ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ۔

(سورہ انعام ۶۰)

اِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيَامَهِ۔

(سورۂ آل عمران ۱۸۵)

وہ خدا وہ ہے جو رات کے وقت تمہارے اعمال (کی فہرست) پوری کرتا ہے (یعنی نیند غالب کرتا ہے) اور جو کچھ تم نے دن کو کیا تھا اس کو وہ جانتا ہے، پھر تمہیں کو اٹھا کر کھڑا کر دیتا ہے تا کہ

تمہاری معینہ مدت حیات پوری ہو پھر تمہاری بازگشت اسی کی طرف ہے اور اس کے بعد جو کچھ تم کرتے تھے اس کی تمہیں خبر دے گا۔ تمہارے کردار کا پورا بدلا قیامت کے دن تمہیں دیا جائے گا۔

تیسری آیت:۔ اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا۔ (سورہ زمر ۴۲)

خدا نفوس کے اعمال کو پورا کرتا ہے ان کی موت کے وقت، اور جن کی موت نہیں آئی ہے ان کے سونے میں (اعمال پورے ہوتے ہیں)

اس سے صاف ظاہر ہے کہ توفی کے معنی نہ خاص موت طاری ہونے کے ہیں اور نہ خاص نوم کے معنی ہیں، بلکہ ایک ایسے معنی ہیں جو موت وخواب میں یکساں پائے جاتے ہیں اور وہ دن پورا کرنے کے معنی ہیں۔ تعجب ہے کہ مدیر نگار نے آیت اولیٰ کے معنی سمجھنے میں سخت غلطی کی ہے اور وہ لکھتے ہیں کہ ''خود کلام مجید میں بھی اور دیگر مقامات پر بھی لفظ **توفی** مارنے کے معنی میں آیا ہے اسی کے ذیل میں اس آیت کا بھی حوالہ دیا ہے۔

''وَهُوَ الَّذِيْ يَتَوَفّٰكُمْ بِالَّيْلِ حالانکہ یہاں يَتَوَفّٰكُمْ کے معنی سوائے نوم کے کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ موت کو رات سے کون سی خصوصیت ہے کہ کہا جائے خدا تمہیں رات کو مردہ کرتا ہے اس کو ہر موٹی عقل کا شخص بھی سمجھ سکتا ہے۔

یہ قرآنی شواہد تھے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ **توفی** کے معنی موت میں منحصر نہیں بلکہ نوم میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر ارباب لغت کے کلمات پر نظر کی جائے تو یہ مطلب بالکل صاف ہو جاتا ہے۔ لغت کی سب سے زائد مستند کتاب صحاح جوہری ملاحظہ ہو۔

استوفی حقه و توفاه بمعنی **استوفی حقه** یعنی اپنے حق کو پورا لے لیا اور توفی حقه دونوں کے ایک معنی ہیں
(ص ۵۶۳، مطبوعہ مصر)

اس سے معلوم ہوا کہ معنی حق کا پورا لے لینا ہیں۔ علامۂ محدث مجدالدین فیروز آبادی قاموس میں لکھتے ہیں۔

اوفی علیه اشرف وفلا نأحقه اعطاه وافیا کوفاه واوفاه فاستوفاه وتوفاه۔

اوفیٰ علیه یعنی قریب پہنچا اس کے اور **اوفی فلاناً حقه** یعنی اس کا پورا حق دے دیا مثل وفاہ اور اوفاہ کے اور دوسری جانب سے (یعنی حق کے پورا لینے کے معنی میں) **استوفاه او توفاه** آتا ہے۔

اس کے بعد کوئی شبہ نہیں رہ سکتا کہ توفی کے اصلی معنی موت نہیں ہیں اسی وجہ سے امام راغب اصفہانی نے **مفردات فی غریب القرآن** میں **توفی** کے معنی تحریر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ **وقد عبر عن الموت والنوم بالتوفی** یعنی موت اور نوم کی توفی سے تعبیر کی گئی ہے (صفحہ ۵۵۰/) اس سے صاف ظاہر ہے کہ توفی کے اصل معنی موت یا نوم کے نہیں ہیں بلکہ کسی مناسبت سے اس کی تعبیر توفی سے کی جاتی ہے اور یہ بالکل ہمارے خیال کے مطابق ہے جس کی توضیح ہم سابق میں کر چکے ہیں۔

جب یہ امر بالکل واضح ہو گیا تو صرف مُتَوَفِّيْكَ یا تَوَفَّيْتَنِيْ کے لفظ سے حضرت عیسیٰؑ کی موت کیونکر ثابت ہو سکتی ہے؟ جب کہ حقیقی معنی یعنی مدت کا پورا کرنا اس مقام پر بلا کسی تاویل کے درست ہو سکتے ہیں، اور مدیر نگار کا یہ کہنا کہ ''اخیر کی آیت میں **توفیتنی** کے معنی سوائے مارنے کے اور کوئی لئے ہی نہیں جا سکتے کیونکہ اگر کوئی اور معنی لئے جائیں گے تو مفہوم بالکل غلط ہو جائے گا، محتاج توضیح ہے۔ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِيْ كُنْتَ اَنْتَ الرَّقِيْبَ عَلَيْهِمْ کے معنی اگر یہ کہے جائیں کہ ''جب میرے زمانے کو تو نے پورا کیا تو تو ان کا نگراں تھا اور حقیقتاً یہی معنی درست ہیں تو اس میں کون سی خرابی ہے؟ اور مفہوم میں کیا خلل ہوتا ہے؟

قرآن مجید میں صاف صاف عیسیٰؑ کے مقتول ہونے اور سولی پر چڑھائے جانے کی نفی کی گئی ہے ملاحظہ ہو۔

وَقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ

مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا۔ (سورہ نساء ۱۵۷،۱۵۸)

اوران کا کہنا کہ ہم نے مسیح بن مریمؑ رسول خدا کوقتل کرڈالا حالانکہ نہ انہوں نے اس کوقتل کیا اور نہ سولی دی، مگر یہ کہ وہ شبہ میں ڈال دیئے گئے اور یقینا جولوگ اس میں اختلاف کرتے ہیں وہ شک میں ہیں، ان کوسوائے ظن وگمان کی پیروی کے کوئی علم اس کا نہیں ہے، اور یقیناً انہوں نے مسیح کوقتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اس کو اپنی جانب اٹھالیا ہے اوراللہ غالب وحکیم ہے۔

درحقیقت چونکہ حضرت عیسیٰؑ کے متعلق دوگروہ تھے ایک یہود جس کا خیال تھا کہ ہم نے عیسیٰؑ کوسولی پر چڑھایا اورقتل کرڈالا، دوسرے عیسائی کہ جوقتل کی تو نفی کرتے تھے مگر سولی پر چڑھانے کے یہ بھی قائل تھے، خداوندعالم نے ان دونوں فرقوں کی رد کی مَا قَتَلُوْهُ سے یہود کےقول کی تکذیب کی کہ ان کا یہ خیال کہ حضرت مسیحؑ کوقتل کرڈالا ہے بالکل غلط ہے اور وَمَا صَلَبُوْهُ کہہ کے عیسائیوں کو جھٹلایا گیا ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کوسولی دی گئی بلکہ سولی کسی اورشخص کودھوکے سے دی گئی جوحضرت عیسیٰؑ کے مشابہ تھا اور بنابریں اکثر اقوال شُبِّهَ لَهُمْ سے یہی مقصود ہے کہ انہوں نے مشتبہ ہوکے دوسرے شخص کوسولی دے دی۔

مدیرنگار نے شُبِّهَ لَهُمْ کے یہ معنی لکھے ہیں کہ یہودی مسیح کی موت یا ان کےقتل کئے جانے کے مسئلہ میں دھوکہ میں مبتلا ہوگئے یعنی وہ ہلاک ہوئے نہیں اور انہیں مردہ سمجھ لیا گیا۔ ’’بے شک اگرصرف وَمَا قَتَلُوْهُ کی لفظ ہوتی تو یہ معنی درست ہوسکتے کہ ان کومسیح کےقتل میں دھوکہ ہوا کہ وہ زندہ تھے مگر ان کو مردہ سمجھ لیا گیا لیکن وَمَا صَلَبُوْهُ کی موجودگی میں ان الفاظ سے یہ مفہوم اخذ کرنا نہایت ناروا جسارت ہے اس لئے کہ اس وقت میں یہی معنی ہوسکتے ہیں کہ یہودیوں کومسیح کےقتل کرنے اورسولی چڑھانے میں اشتباہ ہوگیا اب سوائے اس کے کہ کسی دوسرے شخص کودھوکے سے سولی دی گئی اورکوئی معنی ہوہی نہیں سکتے۔

اور یہ کہنا کہ ’’قرآن پاک میں قتل وصلیب دونوں کی نفی ساتھ ساتھ کی گئی ہے اور یوں ارشاد ہوا ہے وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ جس سے صاف ظاہر ہے کہ مَا صَلَبُوْهُ کا مفہوم بھی وہی ہے جو مَا قَتَلُوْهُ کا ہے یعنی ان کوصلیب پر چڑھانے کے بعد جو اصل مقصود تھا حاصل نہیں ہوا اور وہ ہلاک نہیں ہوئے اس لئے کہ جب صلیب دینے کا کوئی نتیجہ نہ نکلا تو یہ کہنا عام محاورہ کے بالکل مطابق ہے کہ نہیں صلیب بھی نہیں دی گئی۔ بالکل غلط ہے ارباب معانی وبیان واقف ہیں کہ تاسیس تاکید سے بہتر ہوا کرتی ہے اگر مَا قَتَلُوْهُ کا فقرہ نہ ہوتا تو خیال ہوسکتا تھا کہ مَا صَلَبُوْهُ کی لفظ کنایہ ہے عدم قتل سے لیکن جب کہ تصریحاً قتل کی نفی کردی گئی تو پھر کنایۃً اسی مطلب کو ادا کرنا بالکل بلاغت کے خلاف ہے اس کے علاوہ قتل وصلب ایک ہی نفی کے تحت میں نہیں ہیں تا کہ مجموعاً اس کے مفاد کو منفی سمجھا جائے بلکہ دوبارہ حرف نفی کا اعادہ کیا گیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ مستقلاً دو چیزوں کی نفی ہے اوراس کے معنی یقینا یہی ہیں کہ نہ انہوں نے مسیحؑ کوقتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو اس بارے میں دھوکہ ہوا۔ مسیحؑ کے بدلے کسی اورشخص کوسولی دی اور سمجھے کہ مسیحؑ کوسولی پر چڑھایا ہے۔ رہ گیا مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ کا فقرہ تو یہ بالکل مدیرنگار کے مقصود سے ربط نہیں رکھتا کیونکہ سلسلۂ آیت یوں ہے۔

اِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ مِّنْهُ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْنًا۔

جولوگ کہ اس میں جھگڑا کررہے ہیں وہ شک میں مبتلا ہیں ان کو کچھ علم نہیں ہے سوائے ظن وگمان کا اتباع کرنے کے اور انہوں نے یقینا مسیحؑ کوقتل نہیں کیا ہے۔

اس کے متعلق مفسرین میں اختلاف ہے کہ یہ اختلاف و شک کس امر میں تھا بعض نے کہا ہے کہ یہودیوں نے مسیح کے گھر میں ان کے ڈھونڈھنے کے لئے ایک شخص کو بھیجا، خدا نے عیسیٰؑ کوتو آسمان پر اٹھالیا اوراس شخص پر مسیح کی صورت کا دھوکہ ہونے لگا، ان

لوگوں نے اس کوعیسیٰؑ سمجھ کے سولی پر چڑھایا، اس کے بعد اختلاف ہوا کہ اگر عیسیٰؑ تھے تو ہمارا ساتھی کیا ہوا، اور اگر یہ ہمارا ساتھی تھا تو عیسیٰؑ کہاں ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ شک اس وجہ سے کہ وہ لوگ کہتے تھے کہ چہرہ تو عیسیٰؑ کا سا ہے مگر جسم ان کا سا نہیں ہے بہر حال مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ کا فقرہ اس نزاع سے مرتبط ہے اور مدیر نگار کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔

خداوند عالم نے صاف تصریح فرمائی ہے کہ حضرت عیسیٰؑ قتل نہیں کئے گئے بلکہ خدا نے انہیں آسمان پر اٹھالیا، ارشاد ہوتا ہے۔

وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزاً حَكِيْماً۔ (سورہ نساء ۱۵۸)

انہوں نے یقینا مسیحؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے، اور خدا بڑا عزت دار و باحکمت ہے۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے۔

اِذْ قَالَ اللّٰهُ يَا عِيْسٰٓى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ۔

(سورہ آل عمران ۵۵)

جب کہ خدا نے کہا اے عیسیٰؑ میں تمہارے زمانہ کو پورا کرنے والا اور تمہیں اپنی طرف اٹھا لینے والا ہوں۔

ان دونوں آیتوں سے صاف واضح ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کو آسمان پر اٹھالیا گیا مگر مدیر نگار اس کو قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ:۔

''یہاں رفع (اٹھانے) سے مراد رفع جسم (جسم کا اٹھانا) نہیں ہے بلکہ رفعت مرتبت مراد ہے۔ اول تو رفعت مرتبت مجازی معنی ہیں اور بغیر قرینہ کے حقیقی معنی سے عدول کی کوئی وجہ نہیں، دوسرے اگر صرف رافعك اور رفعه الله کی لفظ ہوتی تو اس کے معنی رفعت مرتبت کے لئے جاسکتے تھے مگر رافعك الیّ اور رفعه الله الیه یعنی خدا نے ان کو اپنی طرف بلند کیا۔'' اس کے معنی سوائے رفعت جسم کے اور کچھ ہو ہی نہیں سکتے۔ اس کے علاوہ اگر غور کیا جائے تو رفعت مرتبت کے معنی اس آیۂ مبارکہ میں احتمال ہی نہیں ہوسکتا۔ ''وَمَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً بَلْ رَفَعَ اللّٰهُ اليه۔ انہوں نے ہرگز عیسیٰؑ کو قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے آپ کو اپنی طرف بلند کرلیا۔ نفی کے بعد جو بل سے اضراب کر کے کسی چیز کا اثبات کیا جاتا ہے تو یہ پہلی بات سے ایک جداگانہ ومنافی چیز ہوتی ہے۔ مثلاً کسی شخص سے یہ کہنا درست ہوگا کہ ما اصبتك بسئو بل اکرمتك میں نے تمہارے ساتھ کوئی برائی نہیں کی بلکہ تمہارا اکرام کیا اس وجہ سے کہ اکرام برائی کرنے کے خلاف چیز ہے لیکن یہ اگر کہا جائے کہ میں تمہاری تعظیم کو نہیں کھڑا ہوا تھا بلکہ تمہارا اکرام تو یہ ایک بے معنی کلام ہوگا اس کی وجہ یہی ہے کہ اکرام تعظیم کے لئے کھڑے ہونے سے کوئی مخالفت و منافات نہیں رکھتا۔ خداوند عالم ارشاد فرماتا ہے کہ مَا قَتَلُوْهُ يَقِيْناً بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ اس کے معنی اگر یہ ہوں گے کہ یہودیوں نے عیسیٰؑ کو یقیناً قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کے مرتبہ کو بلند کیا۔'' تو یہ ایک ایسا کلام ہوگا جس کے معنی سمجھنے سے عقل قاصر ہے اس لئے کہ یہودیوں کے قتل کرنے سے مرتبہ کا بلند ہونا منافات نہیں رکھتا بلکہ شہدا کے لئے دشمنان خدا کے ہاتھ سے قتل ہونا باعث زیادتی رفعت مراتب ہے۔ ہاں جب رفعت کے معنی رفعت جسم کے لئے جائیں تو معنی بالکل درست ہیں کہ انہوں نے عیسیٰؑ کو ہرگز قتل نہیں کیا بلکہ خدا نے ان کو زندہ اپنی طرف اٹھالیا۔ اب بل کا مفاد بھی درست ہے اور کلام بھی مربوط ہے۔ اگر فہم سے کام لیا جائے تو یہ مطالب قابل اشتباہ نہیں ہیں۔ مدیر نگار معلوم نہیں کیا سمجھ کے وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا کے فقرہ کو رفعت مرتبہ کے مؤید سمجھتے ہیں حالانکہ یقیناً مطهرك کے معنی منجيك کے سوا کچھ نہیں ہوسکتے اور وہ رفعت جسم کے ساتھ مربوط ہے رفعت مرتبہ سے اس کو کوئی ربط نہیں۔

اور یہ کہنا کہ ''کلام مجید میں صراحتاً اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ کے الفاظ پائے جاتے ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ رفع آسمان کا واقعہ آپ کی وفات کے بعد ہوا ہے'' بالکل علم نحو و لغت سے ناآشنائی پر مبنی ہے۔ یہ درست نہیں ہے کہ متوفيك

وفات بمعنی موت سے ماخوذ ہے۔اس کے علاوہ اگر اس کو مان لیا جائے کہ یہاں توفیؔ کے معنی مردہ کرنے کے ہیں تب بھی مخاطب کو اس سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا، اس لئے کہ جمہور نحویین کے نزدیک واو مطلق جمع کے لئے ہے ترتیب کے لئے نہیں ہے، اگر مثل ف کے واو ترتیب کے لئے ہوتا تو یہ معنی لینا ممکن تھا کہ ہم پہلے تمہارے اوپر موت طاری کریں گے پھر تم کو اپنی طرف بلند کریں گے لیکن جبکہ مطلق جمع کے لئے ہے تو یہ ثابت نہیں ہوسکتا کہ موت رفع آسمان کے پہلے ہی ہوئی بلکہ مقصود حضرت اقدس الٰہی یہ ہوگا کہ یہودی خیال کرتے ہیں کہ ہم عیسیٰؑ کو قتل کریں گے۔ اے عیسیٰؑ! تم مطمئن رہو، ہم تمہیں اپنے پاس اٹھائے لیتے ہیں اور کفار سے نجات دیئے دیتے ہیں اور موت وحیات ان کے اختیار میں نہیں، جب وقت تمہاری موت کا آئے گا اور عمر معین تمام ہوگی اس وقت ہم موت طاری کریں گے۔ اس میں مفاد آیت کی کوئی مخالفت نہیں ہے اگرچہ حق یہ ہے کہ یہاں **متوفیك** کے معنی **مماتك** کے ہیں نہیں، جیسا کہ ہم سابق میں توضیح کرچکے ہیں۔

قرآن مجید سے ثابت ہوگیا کہ حضرت عیسیٰؑ نہ یہودیوں کے ہاتھ سے قتل ہوئے نہ سولی پر چڑھائے گئے بلکہ خدا نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھالیا اس کے علاوہ جناب رسالتمآبؐ کے احادیث سے قطعاً ثابت ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور آخر زمانہ میں آسمان سے زمین پر اتریں گے۔

امام بخاری و مسلم نے صحیحین میں روایت کی ہے۔

قَالَ النَّبِیُّ صلی الله علیه وسلم ان عیسیٰؑ بن مریمؑ لم یمت وانه راجع الیکم قبل یوم القیامة۔

حضرت رسولؐ نے فرمایا ہے کہ یقیناً عیسیٰؑ بن مریمؑ مرے نہیں اور وہ پلٹیں گے تمہاری طرف قبل روز قیامت کے۔

دوسری حدیث

عنه صلی الله علیه وسلم کیف اذا نزل ابن مریمؑ فیکم وامامکم منکم۔

حضرت رسولؐ سے منقول ہے کہ فرمایا آپ نے کیا حال ہوگا تمہارا، جب تم میں ابن مریمؑ نازل ہوں گے، اور تمہارا امام تم میں سے ہوگا۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ محرم الحرام ۱۳۴۶ھ/جولائی ۱۹۲۷ء ص ۲۱، ۳۱)

جب کہ ان آیات و احادیث صحاح کو دیکھتے ہوئے کسی طرح حضرت عیسیٰؑ کو مردہ نہیں سمجھا جاسکتا تو لامحالہ **توفی** کے معنی آیات سابقہ میں حسب ذیل صورتوں میں منحصر ہیں۔

(۱) متوفیك بمعنی قابضك من الارض الی السماء یعنی میں تم کو زمین سے آسمان کی طرف اٹھالوں گا، جیسا کہ عرب میں محاورہ ہے کہ **توفیت مالی** یعنی **قبضة** اپنے مال کو میں نے لے لیا۔

(۲) توفی کے معنی پورا لینے کے ہوں، اس صورت میں **متوفیك** کے معنی یہ ہوں گے کہ **اِنِّی رَافِعُكَ اِلَیَّ وافیاً لم نیالوا منك شیئاً** یعنی میں تم کو اپنی طرف صحیح اٹھاؤں گا اور کفار تم کو کوئی ضرر نہ پہنچا سکیں گے اور یہ ماخوذ ہے عرب کے محاورہ سے کہ **توفیت کذا واستوفیته** یعنی **اخذته تاماً** میں نے اسے پورا لے لیا۔

(۳) متوفیك بمعنی منیمك ورافعك الی فی النوم یعنی ہم تمہارے اوپر نیند غالب کریں گے اور اس حالت میں تم کو اپنی طرف اٹھالیں گے، جیسا کہ ربیع سے منقول ہے **قال رفعه نائماً ویدل علیه قوله تعالیٰ وهوالذی یتوفاکم باللیل ای بنیهم۔**

ان سب معانی سے زیادہ ظاہر معنی وہ ہیں جو ہم قبل اس کے لکھ چکے ہیں کہ **متوفیك** کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہاری مدت کا پورا کرنے والا ہوں چنانچہ مفسرین نے بھی اسی طرح تفسیر کی ہے اور اس کے بعد دیگر معانی کو احتمالاً ذکر کیا ہے۔ علامہ ابوالسعود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

یا عیسیٰؑ انی متوفیك ای مستوف اجلك ومؤخرك الیٰ اجلك المسمیٰ عاصماً لك من

قتلهم او قابضك من الارض من توفيت مالی او متوفيك نائماً اذ روی انه رفع وهونا ئم وقيل مميتك فی وقتك بعد النزول من السماء ورافعك الان او مميتك عن الشهوات العائقه عن العروج الیٰ عالم الملكوت وقيل اماته الله سبع ساعات ثم رفعه الی السّماء واليه ذهبت النصاریٰ قال القرطبی والصحيح ان الله تعالیٰ رفعه من غير وفاة ولا نوم كما قال الحسن وابن زيد وهو اختيار الطبری وهو الصحيح عن ابن عباس رضی الله عنهما (حاشیہ تفسیر کبیر صفحہ ۶۸۹)

یا عیسیٰؑ انی متوفیك اس کے معنی یہ ہیں کہ میں پورا کرنے والا ہوں تمہاری مدت کا اور ان لوگوں کے قتل سے تمہاری حفاظت کرتے ہوئے عمر معین تک تمہیں باقی رکھنے والا ہوں یا میں تمہیں زمین سے اٹھا لینے والا ہوں۔ توفیت مال کے محاورہ سے یا تم پر نیند غالب کرنے والا ہوں اس لئے کہ روایت میں آیا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سوتے میں آسمان پر اٹھائے گئے اور بعض نے کہا ہے کہ یہ معنی ہیں کہ تمہیں مردہ کرنے والا ہوں وقت معین پر بعد آسمان سے اترنے کے، اور اس وقت تمہیں اپنی طرف اٹھائے لئے لیتا ہوں یا تمہارے نفس کو ان شہوات سے جو ترقیات اخرویہ سے مانع ہیں مردہ کر دینے والا ہوں اور بعض نے کہا ہے کہ خدا نے عیسیٰؑ کو سات گھنٹہ مردہ رکھا پھر ان کو آسمان پر اٹھایا اور نصاریٰ نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ قرطبی نے کہا کہ صحیح یہ ہے کہ خدا نے ان کو بغیر موت یا خواب کے (بیداری میں) اٹھایا، جیسا کہ حسن اور ابن زید نے کہا ہے، اور طبری کا مختار بھی یہی ہے اور ابن عباس سے بھی صحیح روایت یونہی وارد ہوئی ہے۔ اور مسلم الثبوت مفسر علامۂ بیضاوی اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

یا عیسیٰؑ انی متوفيك ای مستوف اجلك ومؤ خرك الی اجلك المسمّٰی عاصماً اياك عن قتلهم او قابضك من الارض من توفيت مالی او متوفيك نائماً اذ روی انه رفع نائماً۔ (صفحہ ۷۵)

یا عیسیٰؑ انی متوفیك کے معنی یہ ہیں کہ میں تمہاری مدت کو پورا کرنے والا ہوں اور ان لوگوں کے قتل کرنے سے تمہاری حفاظت کرتے ہوئے تمہیں عمر معین تک باقی رکھوں گا یا تمہیں اٹھانے والا ہوں زمین سے۔ توفیت مالی کے محاورہ سے یا تم پر نیند غالب کرنے والا ہوں اس لئے کہ روایت میں وارد ہوا ہے کہ حضرت عیسیٰؑ سوتے میں آسمان پر اٹھائے گئے۔

اس تمام بیان سے مثل آفتاب نصف النہار کے روشن ہو گیا کہ ان آیات میں توفی کے معنی نبوت کے نہیں ہیں اور ان سے موت پر استدلال کرنا جہالت ونادانی یا مغالطہ وسخن پروری ہے۔

اس کے علاوہ مدیر نگار موت حضرت عیسیٰؑ پر ایک آیت سے استدلال کرتے ہیں اور وہ یہ ہے۔

وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ وَكَهْلاً ۔ (سورۂ آل عمران ۴۶)

مسیحؑ لوگوں سے گہوارہ میں اور کمال قوت کی حالت میں (یکساں) بات کریں گے۔

مدیر نگار نے آیت کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ مسیحؑ بات کرے گا گہوارہ میں اور عالم ضعیفی میں'' اس کے بعد لکھتے ہیں کہ ''لفظ کہلا'' سے صاف طور پر یہ امر واضح ہوتا ہے کہ کلام مجید میں مسیحؑ کے عمر طبیعی تک کی پیشین گوئی موجود ہے، پھر جب مسیحؑ کا عمر طبیعی تک پہنچنا اس طرح ثابت ہے تو یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ آپ صلیب سے نہیں مرے کیونکہ جس وقت آپ کو صلیب دی گئی آپ کی عمر ۳۲ رسال کچھ دن کی تھی اور اس عمر کے انسان کو کہلاً (ضعیف) نہیں کہہ سکتے اور اس صورت میں متوفیك کے معنی وہی لئے جائیں گے جو ہم نے بیان کئے ہیں۔

کہل کے معنی ضعیف، معلوم نہیں کس لغت میں لکھے ہوئے ہیں ہاں کہل اس شخص کو کہتے ہیں جس پر آثار پیری ظاہر ہو چکے ہوں لیکن اس لفظ کے یہی ایک معنی نہیں ہیں بلکہ کہل کے ایک معنی کامل اور تام القوۃ کے بھی ہیں اور بنابر تصریح

مفسرین اس مقام پر بھی یہی معنی مراد ہیں، چنانچہ علامہ فخر الدین رازی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

الکھل فی اللغة ما اجتمع قوته و کمل شبا به وھو ماخوذ من قول العرب اکتھل النبت اذا قوی ومن ثم قال الاعشی۔

کہل لغت میں اس چیز کو کہتے ہیں جس کی قوت کامل اور جوانی بھرپور ہوجائے اور یہ عرب کے قول سے ماخوذ ہے کہ وہ کہتے ہیں اکتھل النبت یعنی گیاہ حد کمال تک پہنچ گئی۔اعشی شاعر کہتا ہے۔یضاحك الشمس منھا کوکب شرق

موزر بجیم النبت مکتھل اراد بالمکتھل اللمتناھی فی الحسن والکمال۔ (صفحہ ۶۷۶)

وہ گہر جو ستارہ تابندہ کے مثل آفتاب کی ہنسی اڑاتا ہے اور وہ کہر گھرا ہوا ہے کثیر گیاہ کے ساتھ مکتھل ہے "مکتھل سے مقصود یہ ہے کہ وہ حسن وکمال میں منتہائے درجہ پر ہے۔

اس کے بعد آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ

بیّنا ان الکھل فی اصل اللغة عبارة عن الکامل التام و اکمل احوال الانسان اذا کان بین الثلاثین والا ربعین فصح و صفه بکونه کھلاً فی ھذا لوقت۔

ہم بیان کرچکے ہیں کہ کہل اصل لغت میں کامل وتام کو کہتے ہیں اور انسان کا منتہائے کمال اس وقت ہوتا ہے جب وہ تیس اور چالیس کے درمیان میں ہو، لہٰذا حضرت عیسیٰؑ کو کہل کہنا (۳۲ر برس کی عمر میں) درست ہوا۔

اس کے علاوہ قاموس میں تصریح ہے کہ کھل کے معنی ہیں من جاوز الثلاثین یعنی جس کی عمر تیس سال سے زیادہ ہو (صفحہ ۵۱۶) اس صورت میں بلا اشکال حضرت عیسیٰؑ پر کہل کا اطلاق درست ہے، اس لئے کہ بتصریح مخاطب جب یہودیوں نے صلیب دینے کا ارادہ کیا ہے تو حضرت عیسیٰؑ کی عمر ۳۲ر سال کچھ دن کی تھی۔

اور اگر مان بھی لیا جائے کہ کہل کے معنی اس مقام پر ادھیڑ اور ضعیف العمر ہی کے ہیں تب بھی مطلوب کے مضر نہیں ہے کیونکہ ہمارا مسلمہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ آخر زمانہ میں آسمان سے زمین پر اتریں گے تو ہوسکتا ہے کہ آیت کا اشارہ اسی موقع کے متعلق ہو جیسا کہ علامہٗ رازی لکھتے ہیں۔

الثانی ھو قول الحسین بن الفضل البجلی ان المراد بقوله و کھلاً ان یکون کھلاً بعد ان ینزل من السماء فی آخر الزمان ویکلم الناس ویقتل الدجال قال الحسین بن الفضل وفی ھذہ الایة نص فی انه علیه الصلوٰة والسلام سینزل الی الارض۔

(اس آیت کے متعلق) دوسرا قول حسین بن فضل بجلی کا ہے کہ مراد کھلاً سے یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ ادھیڑ ہوں گے اس وقت جب آخر زمانہ میں آسمان سے اتریں گے اور اس وقت لوگوں سے بات کریں گے، اور دجال کو قتل کریں گے۔حسین بن فضل نے کہا ہے کہ یہ آیت نص ہے اس بات پر کہ حضرت عیسیٰؑ علیہ الصلوٰۃ والسلام عنقریب زمین پر اتریں گے۔

بہرحال اس میں کوئی شبہ نہیں رہا کہ حضرت عیسیٰؑ زندہ ہیں اور ان کی موت واقع نہیں ہوئی ہے اور اس کا انکار انکار قرآن وحدیث ہے اور آیات قرآنیہ سے حضرت عیسیٰؑ کی موت پر استدلال کرنا سخت ناروا جسارت اور واضح غلطی ہے۔

رہ گیا انجیل کے روایات سے استدلال تو وہ کسی طرح اسلامی نقطۂ نظر سے درست نہیں ہے کیونکہ نہ یہ انجیل کلام الٰہی ہے اور نہ حضرت عیسیٰؑ پر یہ نازل ہوئی تھی اور نہ یہ وہ کتاب ہے جس کی تصدیق کرنے کے لئے قرآن اترا تھا اور جس کو مُصَدِّقاً لِّمَا بَیْنَ یَدَیْهِ کے الفاظ سے بتلایا گیا ہے۔

اس مقام پر بالکل بے محل ہے کہ ہم اس کی توضیح پر قلم اٹھائیں، یہ نصاریٰ کے اور ہمارے درمیان میں جنگ آزما مسئلہ ہے جس کے لئے ایک طویل مضمون درکار ہے اگر وقت وفرصت

نے مساعدت کی تو آئندہ ایک مفصل مضمون میں انجیل وتوریت کے عدم اعتبار پر روشنی ڈالیں گے۔

تیسرا باب

معجزات عیسیٰؑ علیہ السلام

مدیر نگار کے انکار کا تیسرا نقطۂ نظر ان معجزات سے تعلق رکھتا ہے جن کو صاف صاف قرآن مجید میں عیسیٰؑ کے لئے ثابت کیا گیا ہے۔ سب سے پہلے عقلی حیثیت سے اس بات کو سمجھ لینا چاہئے کہ ہر نبیؑ کی تصدیق کے لئے معجزہ کی ضرورت ہے، اس لئے کہ نبوت ایسی چیز ہے جس کے ادعا پر طبائع اہل عالم متوجہ ہیں ایسا مرتبۂ جلیلہ جو تمام عالم کو اپنے سامنے سرخم کرنے کا اشارہ کرتا ہو۔ ہر شخص کی خواہش کہ ہم اس مرتبہ کے حقدار مان لئے جائیں تا کہ ہمارے سامنے اہل عالم کی گردنیں خم ہوں۔ چنانچہ اس کی نظیریں مشاہدہ میں آتی رہتی ہیں اور روزانہ نبوت کے دعویدار پیدا ہوتے رہتے ہیں۔

دور اول میں مسلمہ کذاب وطلحہ بن خویلد وغیرہ، دور وسط میں ابوطیب متنبی (شاعر مشہور) اور اس دور اخیر میں مرزا غلام احمد قادیانی وغیرہ کی نظیریں موجود ہیں اور ظاہر ہے کہ نبوت ایسی چیز نہیں ہے جس کا حواس خمسہ میں سے کسی حاسہ سے ادراک ہو سکے اور اگر ہر دعوائے نبوت کرنے والے کی تصدیق صرف اس کے ادعا پر کر دی جائے تو نظام عالم میں خلل ہو جائے گا۔ ایک وقت میں ہزاروں ادعائے نبوت کرنے والے پیدا ہوں گے اور ہر شخص اس کی جرأت کرے گا کہ وہ اپنے تئیں خدا کا فرستادہ بتائے، لہٰذا ضرورت ہے کہ کوئی معیار ہو، جس کی وجہ سے سچے اور جھوٹے میں تمیز ہو سکے، اور معلوم ہو سکے کہ کون شخص واقعی خدا کا مبعوث کیا ہوا نبی ہے اور کون شخص اپنے دعوے میں کاذب وغلط گو ہے، وہی معیار معجزہ ہے۔

جو شخص دعوائے نبوت کر رہا ہے اس نے اگر اپنے دعوے کی تصدیق میں ایک ایسے خلاف عادت امر کو ظاہر کیا کہ جس سے اہل عالم عاجز ہیں تو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ شخص خدا کا فرستادہ ہے اس لئے کہ فطرت انسانی کا مقتضا یہ ہے کہ وہ کسی شخص کو ایسی چیز پر قادر دیکھتا ہے کہ جس سے وہ خود عاجز ہے تو اس کے سامنے گردن خم ہو جاتی ہے اور اس کا وقار خواہ مخواہ دل پر چھا جاتا ہے، اگر اس شخص نے اظہار نبوت کیا اور اس کے ثبوت میں معجزہ بھی ظاہر کیا تو یقیناً یہ سچا ہے اس لئے کہ اگر ایسا نہیں تو خدا پر لازم تھا کہ وہ ایک ایسے معارض کو پیدا کرتا ہے جو اس کے دعویٰ کو باطل کر دے ورنہ نقض غرض اور دنیا کا باطل میں مبتلا کرنا ہے۔ اس تقریر سے یہ امر ثابت ہو جاتا ہے کہ جو شخص دعویدار نبوت ہو اس کی سچائی کا معیار یہی ہے کہ وہ معجزہ ظاہر کرے اور سوائے اس کے اور کوئی طریقہ اس کی سچائی کے یقین کرنے کا نہیں ہے لہٰذا کسی نبی مرسل کے معجزات کو سن کر ان کے انکار پر تل جانے کی کوئی وجہ نہیں بلکہ معجزہ ان کی صداقت کا لازمہ ہے۔

معلوم نہیں کہ مدیر نگار دعوائے نبوت کرنے والوں میں سچے اور جھوٹے کا کیا معیار سمجھتے ہیں، ہاں مگر یہ کہ ان کی مایۂ ناز روشن خیالی ووسعت خیالات کے حدود خود خداوند عالم کی قدرت وحکمت بلکہ اصل وجود ہی کو انکار کے دائرہ میں لے آئیں، اور یہ خلاف توقع نہیں اس لئے کہ دماغ کی منتہائے ترقی موجودہ ماحول میں یہی سمجھی جاتی ہے کہ انسان اپنے تئیں ایک بے نیاز وقار ہستی کی نیازمندی سے آزاد کر کے ایک بے شعور ولایعنی شئے یعنی مادہ کی کارفرمائی کا قائل ہو جائے یا قدم دہر کا قائل ہو کے اس خود کر مؤثر سے بے نیاز سمجھنے لگے اور وسعت خیالات کی معراج کمال یہ ہے کہ انسان اپنے انسانی حدود سے ترقی معکوس کی صورت میں تجاوز کر کے اپنے تئیں ایک بے عقل جانور (بندر) کی ذاتی ترقیوں کا نتیجہ خیال کرے۔

ہم خود ان کی نسبت اس خیال کو **اقرار العقلاء علی انفسھم مقبول** کے عقلی نظریہ کے تحت میں جھٹلا نہ سکیں مگر افراد انسانی کی ذاتی حیثیت پر اپنے اس خود ساختہ خیال سے دھبہ لگانے کا ان افراد کو کوئی حق نہیں ہے اور نہ وہ اس کے پابند ہو سکتے ہیں۔ بہر حال اگر اصل وجود باری تعالیٰ ہی کو وسعت

خیالات نے نقطۂ موہوم کر دیا ہو تو نبوت و رسالت کیا چیز ہے اور معجزہ کس کو کہتے ہیں؟ قرآن مجید کے آیات میں صریحاً جن معجزات حضرت عیسیٰؑ کو بیان کیا گیا ہے مدیر نگار ان کے تسلیم کرنے پر تیار نہیں ہیں، مگر ہمیں افسوس ہے کہ صاف صاف کیوں نہیں کہہ دیا جاتا کہ ہم اس قرآن کو نہیں مانتے، انکار قرآن کو اس کے غلط و خلاف تصریح تاویلات کے پردہ میں چھپانے کی کیا ضرورت ہے؟ دنیا کو غلط فہمی میں مبتلا کرنا اور باطل کی حمایت میں حقیقت پر اپنی تائید کا داغ لگانا انسان کے فطری فرائض پر ایک کاری ضرب ہے۔ ہم پہلے وہ آیات نقل کرتے ہیں جن میں خداوند عالم نے حضرت عیسیٰؑ کے معجزات کو بیان کیا ہے۔ پھر مدیر نگار کی ابلہ فریبیوں پر روشنی ڈالیں گے۔

پہلی آیت

اِنِّیْ قَدْ جِئْتُکُمْ بِاٰیَۃٍ مِّنْ رَّبِّکُمْ اَنِّیْ اَخْلُقُ لَکُمْ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ فَاَنْفُخُ فِیْہِ طَیْرًا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَ اُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِیْ بُیُوْتِکُمْ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔

(سورۂ آل عمران ۴۹)

میں تمہاری طرف ایک نشان لے کے تمہارے پروردگار کی طرف سے آیا ہوں، میں تمہارے لئے مٹی سے طائر کی صورت میں ایک چیز بناتا ہوں، پھر اس میں پھونک مارتا ہوں تو خدا کے حکم سے وہ (سچ مچ) طائر ہو جاتا ہے، اور اندھے کوڑھی کو اچھا کرتا ہوں، اور خدا کے حکم سے مردوں کو زندہ کر دیتا ہوں اور تم کو خبر دیتا ہوں ان چیزوں کی جو تم کھاتے ہو اور جو سمیٹ کے اپنے گھروں میں رکھتے ہو یقیناً اس میں تمہارے لئے نشانی ہے اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

دوسری آیت

اِذْ قَالَ اللّٰہُ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ اذْکُرْ نِعْمَتِیْ عَلَیْکَ وَعَلٰی وَالِدَتِکَ اِذْ اَیَّدْتُّکَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ تُکَلِّمُ النَّاسَ فِی الْمَھْدِ وَ کَھْلًا وَّاِذْ عَلَّمْتُکَ الْکِتٰبَ وَالْحِکْمَۃَ وَالتَّوْرٰۃَ وَالْاِنْجِیْلَ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّیْنِ کَھَیْـَٔۃِ الطَّیْرِ بِاِذْنِیْ فَتَنْفُخُ فِیْھَا فَتَکُوْنُ طَیْرًا بِاِذْنِیْ وَ تُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ وَاِذْ کَفَفْتُ بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ عَنْکَ اِذْ جِئْتَھُمْ بِالْبَیِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا مِنْھُمْ اِنْ ھٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِیْنٌ۔

(سورۂ مائدہ ۱۱۰)

جب کہے گا اللہ اے عیسیٰؑ بن مریمؑ یاد کرو میری نعمت کو اپنے اوپر اور اپنی ماں کے اوپر جب کہ میں نے روح القدس کے ذریعہ سے تمہاری مدد کی، تم نے گہوارہ میں اور کمال قوت کی حالت میں لوگوں سے (یکساں) بات کی اور جب کہ میں نے کتاب وحکمت اور توراۃ وانجیل کی تم کو تعلیم دی اور جب کہ تم مٹی سے طائر کی صورت میں ایک چیز بناتے تھے پھر اس میں پھونک مارتے تھے تو وہ طائر ہو جاتی تھی میرے حکم سے اور تم کور مادرزاد کوڑھی کو میرے حکم سے اچھا کرتے تھے اور میرے حکم سے مردوں کو زندہ کرتے تھے اور جب کہ باز رکھا میں نے بنی اسرائیل کو تم سے جس وقت تم ان کے پاس کھلے ہوئے معجزات لائے اور ان میں کافروں نے کہا کہ یہ تو بس کھلا ہوا جادو ہے۔

تیسری آیت

اِذْ قَالَ الْحَوَارِیُّوْنَ یٰعِیْسَی ابْنَ مَرْیَمَ ھَلْ یَسْتَطِیْعُ رَبُّکَ اَنْ یُّنَزِّلَ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ قَالَ اتَّقُوا اللّٰہَ اِنْ کُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ قَالُوْا نُرِیْدُ اَنْ نَّاْکُلَ مِنْھَا وَتَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَکُوْنَ عَلَیْھَا مِنَ الشّٰھِدِیْنَ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ اللّٰھُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَیْنَا مَآئِدَۃً مِّنَ السَّمَآءِ تَکُوْنُ لَنَا عِیْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰیَۃً مِّنْکَ وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَیْرُ الرّٰزِقِیْنَ قَالَ اللّٰہُ اِنِّیْ مُنَزِّلُھَا عَلَیْکُمْ فَمَنْ یَّکْفُرْ بَعْدُ مِنْکُمْ فَاِنِّیْٓ اُعَذِّبُہٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُہٗٓ اَحَدًا مِّنَ الْعٰلَمِیْنَ۔

(سورۂ مائدہ ۱۱۲، ۱۱۵)

جب کہ کہا حوارئین نے کہ اے عیسیٰؑ بن مریمؑ! کیا تمہارا پروردگار ایسا کرسکتا ہے کہ ہم پر آسمان سے دسترخوان اتارے؟ عیسیٰؑ نے کہا کہ اگر ایمان لائے ہوتو خدا سے ڈرتے رہو، انہوں نے کہا ہم چاہتے ہیں اس دسترخوان میں کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں معلوم ہو کہ تم نے ہم سے جو کچھ کہا سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوجائیں۔ عیسیٰؑ نے کہا کہ پروردگار! اتار ہم پر ایک دسترخوان آسمان سے، جو ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لئے عید ہوجائے اور وہ نشانی ہو تیری طرف سے اور ہمیں رزق عطا فرما تو تو بہتر رزق عطا فرمانے والا ہے۔ خدا نے فرمایا کہ اچھا، میں اتاروں گا اس دسترخوان کو تمہاری طرف۔ لیکن اس کے بعد بھی جو شخص تم میں سے کفر اختیار کرے گا اس پر میں ایسا عذاب کروں گا کہ عالم میں کسی پر ویسا عذاب نہ کیا ہوگا۔

ان آیات میں باختلاف عبارات حضرت عیسیٰؑ کے چند معجزہ بیان کئے گئے ہیں۔

(۱) گہوارہ میں گفتگو کرنا (۲) مٹی کی چڑیا بنا کر اس میں روح پھونکنا اور اس کا اڑنے لگنا (۳) کور مادرزاد اور سفیدی کے آزار والے کو اچھا کرنا (۴) مردوں کو زندہ کرنا (۵) مخصوص غیب کی باتیں بیان کرنا کہ لوگ کیا کھاتے ہیں اور کیا گھر میں رکھتے ہیں (۶) ان کی دعا پر آسمان سے دسترخوان کھانے کا نازل ہونا۔

مدیر نگاران تمام معجزات کے منکر ہیں اور ان صریح آیات کو غلط معانی کا جامہ پہنانا چاہتے ہیں۔ اس جگہ چند باتیں مختصراً سمجھ لینا چاہئیں۔

(۱) کلام کے جس وقت دو معنی ہوں ایک حقیقی اور ایک مجازی اور کوئی قرینہ مجازی معنی کی طرف دہن کا موڑنے والا نہ ہو تو اس کلام سے حقیقی معنی سمجھنا چاہئیں، یہ ارباب معانی بیان کا فیصلہ ہے۔ بغیر قرینہ کے مجازی معنی کی طرف کلام کا موڑنا ایک ناروا جسارت اور دنیا کے تمام الفاظ کو افادۂ مطالب سے قاصر کردینے کا ذریعہ ہے۔

(۲) قرآن مجید کے اصل مرادات کا علم سوائے خدا ورسولؐ اور مخصوص بندگانؑ خدا کے کسی کو نہیں ہوسکتا ہے اسی وجہ سے صاف صاف ارشاد ہوا ہے۔ **وَمَا يَعْلَمُ تَأْوِيْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ وَالرّٰسِخُوْنَ فِي الْعِلْمِ** لیکن جن آیات سے کھلم کھلا ایک معنی پیدا ہوتے ہیں اس کے ظاہر سے کنارہ کشی بغیر کسی خاص دلیل کے نہیں کی جاسکتی۔

(۳) چونکہ قرآن مجید اعلیٰ مراتب فصاحت و بلاغت پر نازل ہوا تھا اور اس کی ہر ہر لفظ معانی کے ناپیدا کنار دریا کو اپنے اندر لئے ہوئے تھی اور بنی آدم کی ناقص عقلیں اس کی اصلی تہ تک نہیں پہنچ سکتی تھیں لہذا ان کو قرآن میں اپنی عقل آرائیوں سے روک دیا گیا ہے۔ اور ان کو انہیں تفاسیر کا تابع بنادیا گیا ہے جو مخصوص مفسرین کی زبانی ان تک پہنچی ہوں۔ مسند امام احمد بن حنبل میں ابن عباس سے روایت ہے:۔

من قال فی القران برایه فلیتبوأ مقعده من النار۔

جو شخص قرآن مجید میں اپنی من گڑھت کوئی بات کہے وہ جہنم کی آگ میں اپنی جگہ بنائے۔

(دیکھو جامع صغیر سیوطی صفحہ ۷ مطبوعہ مصر)

دوسری حدیث صحیح ترمذی میں ابن عباس سے ہے۔

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوا مقعده من النار۔

جو شخص قرآن میں بغیر علم کے کوئی بات کہے وہ آتش جہنم میں اپنی جگہ بنالے۔ (جامع صغیر صفحہ ۱۵۱)

تیسری حدیث ابوداؤد و ترمذی و نسائی نے جندب سے روایت کی ہے۔

من قال فی القرآن برایه فاصاب فقد اخطاء۔

جو شخص قرآن میں اپنی عقل سے کوئی بات کہے تو اگر ٹھیک اترے تب بھی اس نے غلطی کی۔ (جامع صغیر صفحہ ۱۵۱)

چوتھی حدیث امام احمد نے مسند میں لکھی ہے۔

من فسر القرآن برایة فلیتبوا مقعده من النار۔

جو شخص قرآن کی اپنی رائے سے تفسیر کرے وہ جگہ اپنی

آگ میں بنا لے۔

(دیکھو کنوز الحقائق مناوی، صفحہ ۱۱ر حاشیہ جامع صغیر، مطبوعہ مصر)

ان تمام احادیث و اخبار سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ علاوہ ان معانی کے جو صاف صاف الفاظ قرآن کا منشا ہیں کسی کو اپنی عقل آرائی اور من گڑھت، چہ می گوئیوں کا حق نہیں ہے اور مفسرین اسلام نے جن حدود میں معانی کو محدود کر دیا ہے ان سے باہر قدم نکالنا خدا کی مرضی کے خلاف اور باعث وبال اخروی ہے۔

اب ہم مدیر نگار کے افادات کی طرف توجہ کرتے ہیں۔

گھوارہ میں بات کرنا

اس کے متعلق مدیر نگار لکھتے ہیں کہ ''اول تو گھوارہ یعنی عالم طفلی میں بچوں کا باتیں کرنا کوئی غیر معمولی بات نہیں۔ بہت سے تندرست بچے شیر خوارگی ہی کے زمانہ میں بولنے لگتے ہیں اور اگر واقعی اس سے اظہار معجزہ کا ہے تو کہلاً بیکار ہوجاتا ہے اور اس کے ذکر کی ضرورت نہیں۔

گھوارہ میں بات کرنے کا اشارہ درحقیقت اس کلام کی طرف ہے کہ ''اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا یعنی میں خدا کا بندہ ہوں اس نے مجھ کو کتاب عطا کی ہے اور نبیؑ بنایا ہے، اور ہم سابق میں ثابت کر چکے ہیں کہ یہ واقعہ مسیحؑ کے عین ولادت ہی کے دن کا ہے، ہمیں معلوم نہیں کہ بچہ کا ولادت کے دن بول دینا غیر معمولی بات ہے یا نہیں؟ غالباً مدیر نگار بولے ہوں تو بولے ہوں مگر عالم کے اور بچے تو اس کمال سے محروم ہیں، اس صورت میں یہ کہنا کہ اور بہت سے تندرست بچے شیر خوارگی ہی کے زمانہ میں بولنے لگتے ہیں'' کہاں تک درست ہے؟

رہ گیا یہ امر کہ اس صورت میں کہلاً کی لفظ کا کیا فائدہ ہے؟ تو عربی ذوق رکھنے والے اس کو سمجھ سکتے ہیں کہ وہ زمانہ جس میں عموماً بچوں کی زبان تکلمی حرکت کرنے کے قابل نہیں ہوتی اور وہ زمانہ کہ جو منتہائی قوت بیانی و طاقت لسانی کا ہے دونوں کو ایک مرتبہ میں ذکر کرنا اور ایک ساتھ ثابت کرنا اس سے یہ معنی پیدا ہوتے ہیں کہ مسیح نے گھوارہ میں اور کمال طاقت میں یکساں کلام کیا'' جس طرح بھرپور جوانی میں تبلیغ رسالت کے فرائض ادا کئے ویسے ہی ایک دن کی عمر میں بھی اِنِّیْ عَبْدُ اللّٰہِ اٰتٰنِیَ الْکِتٰبَ وَجَعَلَنِیْ نَبِیًّا کہہ کے اپنی رسالت کو ظاہر کیا اور جیسے اس زمانہ میں احکام خدا بندگان الٰہی تک پہنچائے اسی طرح اس عمر میں اَوْصٰنِیْ بِالصَّلٰوۃِ وَالزَّکٰوۃِ مَا دُمْتُ حَیًّا کہہ کے احکام الٰہیہ کی تبلیغ کی علامہ بیضاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

یکلم الناس فی المھد و کھلا ای یکلمھم حال کونہ طفلاً و کھلاً کلام الانبیاء من غیر تفاوت۔

اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ بچپنے اور کمال قوت دونوں حالتوں میں انبیاؑ کا سا کلام کریں گے، بغیر فرق کے۔

(صفحہ ۴۷ر مطبوعہ استانبول)

مٹی کے طائر کا طائر ہوجانا

تمام مفسرین کا بیان ہے کہ واقعی حضرت عیسیٰؑ مٹی سے طائر کی صورت میں ایک شکل بنا دیتے تھے اور اس کے بعد اس میں پھونک مارتے تھے وہ طائر ہوجاتی تھی۔ زیادہ سے زیادہ اختلاف اس میں ہے کہ تمام قسم پر قدرت حاصل تھی یا نہیں بلکہ صرف ابابیل اور شب پروں کے متعلق یہ اقتدار خدا کی طرف سے عطا ہوا تھا اس کے مقابل میں دوسرا قول مدیر نگار نے سرسید کا ذکر کیا ہے کہ ''یہ واقعہ حضرت عیسیٰؑ کی عہد طفلی کا ہے، اور بچپن میں لڑکے اس قسم کی باتیں کیا ہی کرتے ہیں۔''

لیکن یہ خیال عقل کی سمجھ سے باہر ہے اور ہمارا فہم اس کے سمجھنے سے قاصر ہے۔ مدیر نگار اگرچہ اس رائے کے مخالف ہیں مگر ان کی مخالفت اس حیثیت سے ہے کہ

''اگر مٹی کی چڑیاں بنا کر ان میں جان ڈال دینے کا واقعہ صرف ان کی عہد طفلی کے کھیل سے متعلق ہوتا تو خدا اپنی نعمتوں کے سلسلۂ بیان میں اس کا ذکر نہ کرتا۔''

شاباش! ''وزیری چنیں شہریاری چناں'' مدیر نگار نے اس بات کو قبول کرلیا کہ عہد طفلی میں بچے مٹی کی چڑیاں بنا کر اس میں جان ڈال دیا کرتے ہیں، مگر سیاق کلام اس معنی سے انکار کرتا ہے

لیکن افسوس ہے کہ ہم عالم میں ایسے بچہ کے دیکھنے کے مشتاق ہیں جس کا عہد طفلی میں کھیل یہ ہو کہ وہ مٹی کی چڑیاں بنا کر اس میں جان ڈال دیا کرتا ہو۔ یہ عجیب وغریب بات ہے کہ عہد طفلی کے کھیل میں تو بچے ایسا کر دیا کرتے ہوں مگر جوان ہونے کے بعد اگر کہا جائے کہ برائے مہربانی ایک مٹی کی چڑیا بنا کر اس میں جان ڈال دیجئے تو ناممکن! یہ منطق عقلا کے فہم سے بالاتر ہے۔

مدیر نگار اس آیت کی تشریح یوں کرتے ہیں کہ ''خلق کے معنی صرف اندازہ کرنے کے ہیں۔ طین (مٹی) سے انسان کی ضعیف پیدائش کی طرف اشارہ ہے، نفخ سے مقصود احکام الٰہیہ کی تعلیم ہے، اور طیر سے وہ انسان مراد ہیں جو عام سطح انسانی سے بلند ہو جائیں۔ کلام مجید میں انسانوں کو دابۃ اور طائر سے تشبیہ دی گئی ہے اسی طرح ناسمجھ لوگوں کو جانوروں (انعام) سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اس لئے اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہو یعنی اپنی پیدائش کے لحاظ سے حقیر ہو، میں طائر کی سی ہیئت دینے کا عزم کرتا ہوں اور پھر تعلیم الٰہی دے کر واقعی بلند پرواز اور بلند خیال انسان بناتا ہوں۔''

قطع نظر اس سے حقیقی معنی کے ہوتے ہوئے اتنے بعید مجازات کا ارادہ لٹریچر کے اصول سے جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ معلوم نہیں کہ حضرت عیسیٰؑ ہمیشہ حقائق کو دوراز خیال تشبیہات کی صورت میں بغیر قرینہ کے بیان کیا کرتے ہوں، یہ یقیناً قائدہ وضع الفاظ وحقائق کے خلاف ہے۔

اس مقام پر الفاظِ قرآن کی ترکیب کو دیکھتے ہوئے مذکورہ تشریح وترجمہ کسی طرح درست نہیں ہوسکتا، اگر عبارت یوں ہوتی کہ اخلقکم وانتم من الطین کھئیۃ الطیر تو یہ ترجمہ درست ہوتا کہ میں تم لوگوں کو جو مٹی سے بنے ہو طائر کی سی ہیئت دینے کا عزم کرتا ہوں لیکن یہاں عزم کا تعلق خود ان لوگوں سے نہیں قرار دیا گیا ہے بلکہ اخلق لکم کہا گیا ہے یعنی تم لوگوں کے لئے خلق کرتا ہوں مٹی سے ایک چیز مثل ہیئت طائر کے۔ اس صورت میں کسی طرح مدیر نگار کے مطلب کا احتمال بھی نہیں ہوسکتا اس کے علاوہ اگر یہ معنی ہوتے کہ میں تم لوگوں کو جو مٹی سے خلق ہوئے ہو احکام الٰہیہ کی تعلیم دے کے بلند پرواز بنا دیتا ہوں، تو اس کے لئے پہلے طائر کی ہیئت کا قصد کرنا اور پھر اس میں نفخ روح کرنا، پھر اس کا طائر ہو جانا، یہ مراتب سب بے کار ہیں نیز فانفخ فیکم ہونا چاہئے کہ تم لوگوں کو ہیئت طیر دینے کا عزم کرتا ہوں پھر تم میں نفخ روح کرتا ہوں کیونکہ مدیر نگار کے معنی کی بنا پر فانفخ فیہ کی ضمیر کا مرجع کوئی دستیاب نہیں ہوسکتا۔ ماننا پڑے گا کہ آیت کے معنی یہی ہیں کہ ''میں بناتا ہوں تمہارے لئے ایک چیز مثل صورت طائر کے اور اس چیز میں روح پھونک دیتا ہوں، وہ طائر بن کے اڑنے لگتی ہے۔

''مدیر نگار کہتے ہیں کہ ''لفظ خلق پیدا کرنے کے معنی میں ہو ہی نہیں سکتا، کیونکہ متعدد آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ خلق (پیدا کرنا) صرف خدا کا کام ہے اور یہ صفت صرف اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔''

ایک تو یہاں خلق کے معنی پیدا کرنے کے قرار دینے کی ضرورت نہیں بلکہ خلق کے معنی صورت بنانے کے ہیں اور معنی آیت کے یہ ہیں کہ میں صورت گری کرتا ہوں تمہارے لئے ایک چیز کی، مثل ہیئت طائر کے۔'' جیسا کہ علامہ فخر الدین رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے اور اس کے بعد قرآن مجید واشعار عرب وامثال سے استدلال کیا ہے۔ (دیکھو صفحہ ۶۸۰ مطبوعہ مصر)

دوسرے یہ کہ اگر یہ کہا جائے کہ خلق کے معنی پیدا کرنے کے ہیں تب بھی کوئی اشکال نہیں ہے کیونکہ بلا شبہ اس نے لَهُ الْخَلْقُ وَالْاَمْرُ کہہ کے خلق کو اپنے لئے مخصوص کیا ہے، مگر ممکن ہے کہ خود خداوند عالم اس خلق کو کسی دوسرے شخص کے ہاتھ پر ظاہر کرے، اس صورت میں بھی درحقیقت خالق خداوند عالم ہی ہے مگر استناد اس کا دوسرے کی طرف مجازاً ہوسکتا ہے، اس کی نظیریں قرآن مجید میں موجود ہیں، توفیٰ (موت طاری کرنے یا نیند غالب کرنے) کو خداوند عالم نے اپنے لئے مخصوص فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے۔

اَللّٰهُ يَتَوَفَّى الْاَنْفُسَ حِيْنَ مَوْتِهَا وَالَّتِيْ لَمْ تَمُتْ فِيْ مَنَامِهَا ۔ (سورۂ زمر ۴۲)

خداوند عالم لوگوں کے زمانہ (عمل) کو تمام کرتا ہے ان کی موت کے وقت اور جنکی موت نہیں آئی ہے ان کے خواب کے وقت۔

دوسری آیت میں ارشاد ہوا ہے، اَللّٰهُ خَلَقَكُمْ ثُمَّ يَتَوَفّٰكُمْ ۔ (سورۂ نحل ۷۰)

خدا نے تمہیں خلق کیا ہے اور وہی پھر تمہارے اوپر موت طاری کرے گا۔

ان دونوں آیتوں میں خداوند عالم نے توفی کو اپنے سے مخصوص فرمایا ہے مگر ایک آیت میں اسی توفی کا ملک الموت کی طرف استناد فرمایا ہے، ارشاد ہوتا ہے۔

قُلْ يَتَوَفّٰكُمْ مَلَكُ الْمَوْتِ الَّذِيْ وُكِّلَ بِكُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ تُرْجَعُوْنَ۔ (سورہ سجدہ ۱۱)

کہہ دو کہ تم پر موت طاری کرتا ہے ملک الموت، جو تم پر مسلط کر دیا گیا ہے، پھر تمہاری بازگشت خدا کی طرف ہے۔

اس کی وجہ یہی ہے کہ چونکہ موت ملک الموت کے ذریعہ سے ظاہر ہوتی ہے لہٰذا مجازاً اس کی طرف استناد کیا گیا ہے اور حقیقۃً موت دینے والا خداوند عالم ہے۔ ایسے ہی یہاں سمجھ لو!

خلق بے شک خدا سے مخصوص ہے مگر قوت اعجازی اور عیسیٰؑ کی صداقت ظاہر کرنے کے لئے ان کے ہاتھوں اس کا ظہور ہوا تو مجازاً عیسیٰؑ کی طرف استناد درست ہے مگر درحقیقت اس کا فاعل خداوند عالم ہوا۔ اسی وجہ سے فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِ اللّٰهِ اور فَيَكُوْنُ طَيْرًا بِاِذْنِيْ کا لفظ ارشاد ہوا ہے یعنی یہ نہ سمجھو کہ عیسیٰؑ نے خود اپنے اقتدار سے خلق کیا، بلکہ یہ خداوند عالم کی طرف سے تھا لہٰذا خالق حقیقی وہی ہے۔ اور آیت کسی طرح دیگر آیات کے مخالف نہیں ہے۔

یہ خیال کہ میں تم لوگوں کو جو مٹی سے خلق ہوئے ہو طائر کی صورت فرض کرتا ہوں پھر تم کو احکام الٰہیہ کی تعلیم سے بلند پرواز بنا دیتا ہوں ایسا خیال ہے جس کے سمجھنے سے تمام مفسرین اسلام کا دماغ قاصر رہا تھا۔ علامہ بیضاوی آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

المعنی اقدر لکم واصور شیئاً مثل صورة الطیر فانفخ فیہ الضمیر للکاف ای فی ذلك الشئی المماثل فیکون طیراً باذن اللہ فیصیر حیاً طائراً بامر اللہ۔ (صفحہ ۷۴)

معنی اس آیت کے یہ ہیں کہ میں قرار دیتا ہوں اور بناتا ہوں تمہارے لئے ایک شے مثل طائر کی صورت کے، اور اس میں یعنی اس طائر کی سی چیز میں روح پھونکتا ہوں، وہ خدا کے حکم سے زندہ ہو کے اڑنے لگتے ہیں۔

(۳) اکمہ وابرص کو شفا دینا

مدیر نگار کا خیال ہے کہ ''اندھے، کوڑھی اور مردہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی روحیں بیمار اور مردہ ہیں اور اندھے کوڑھیوں کو اچھا کرنے اور مردوں کو زندہ کرنے سے مراد یہی ہے کہ میں گنہگاروں سے ان کے گناہ چھڑاتا ہوں اور جو روحیں معصیت سے مردہ ہیں ان کو اخلاق کی تعلیم دے کر زندہ کرتا ہوں۔''

لیکن افسوس کہ کسی لغت میں اکمہ وابرص وموتی کے معنی گنہگار نہیں لکھے ہیں لہٰذا بغیر قرینہ کے اس مفہوم کا مراد لینا خلاف اصول تکلم ہے، مریض کی لفظ سے بے شک کنایہ کافر یا گنہگار سے کیا گیا ہے اس حیثیت سے کہ اس کی روح بیمار ہے جیسا کہ ارشاد ہوا ہے فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (سورۂ بقرہ) مگر اکمہ وابرص، کور مادرزاد اور سفیدی کے آزار والے کی لفظ سے کافر کا کنایہ کرنا نیاز صاحب کی ذہنیت کا نتیجہ ہے، جس تک اہل زبان کا دماغ نہیں پہنچ سکتا۔ قرآن مجید میں کسی مقام پر اعمیٰ (اندھے) کی لفظ کے ساتھ گنہگار سے (اس حیثیت سے کہ اس کی روح بیمار ہے) کنایہ نہیں کیا گیا ہے بلکہ **مایستوی الاعمیٰ** وغیرہ میں اعمیٰ کا کنایہ کفار سے اس جہت سے کیا گیا ہے کہ یہ لوگ آیات خدا پر نگاہ نہیں کرتے اور اس سے چشم پوشی کرتے ہیں، گویا ان کی

آنکھیں ہی نہیں ہیں، یہ بالکل عام محاورہ کے مطابق ہے لیکن کور مادرزاد سے گنہگار کا کنایہ کرنا بالکل اچھوتا خیال ہے۔ وہ کفار جن کو اعمیٰ بتلایا گیا ہے یعنی وہ آیات خدا ودلائل پر نگاہ ہی نہیں ڈالتے ان کو اچھا کر دینا کوئی معنی نہیں رکھتا کیونکہ ان کے متعلق صاف صاف ارشاد ہوا ہے صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُوْنَ یہ لوگ بہرے گونگے اندھے ہیں کبھی راہ راست پر نہیں آسکتے۔(سورہ بقر)

لہٰذا آیت کا حقیقی مفہوم وہی ہے جس کو اس کی لفظیں بول رہی ہیں یعنی حضرت عیسیٰؑ واقعی مادرزاد نابینا اور سفیدی کے آزار والے کو خدا کے حکم سے شفا دیتے تھے اور مردہ کو زندہ کر دیتے تھے چونکہ حضرت کے زمانہ میں اطبا کا زور تھا اور ان کو اپنی کمال حذاقت پر گھمنڈ تھا، اس وجہ سے خداوند عالم کی طرف سے حضرت عیسیٰؑ کو معجزہ اسی کے موافق عطا ہوا تھا۔ کور مادرزاد وابرص کو اتنی جلدی شفا دینا چونکہ اطبائے عصر کے قابو سے باہر تھا لہٰذا ان کو حضرت عیسیٰؑ کے سامنے سر تسلیم خم کرنا لازم تھا۔ علامۂ ابوالسعود اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

وتخصیص ھذین الدائین لانھما مما اعجز الاطباء وکانوا فی غایۃ الحذاقۃ فی زمنہ علیہ الصلوٰۃ والسلام فاراھم اللہ تعالیٰ المعجزۃ من ذلک الجنس روی انہ علیہ الصلوٰۃ والسلام ربما کان یجتمع علیہ الوف من المرضیٰ من اطاق منھم اتاہ ومن لم یطق اتاہ عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ومایداویہ الابالدعاء۔

(حاشیہ تفسیر کبیر مطبوعہ مصر صفحہ ۶۸۰/)

ان دونوں بیماریوں کو اس لئے مخصوص کیا گیا کہ اطبا ان کے علاج سے عاجز تھے اور حضرت عیسیٰؑ کے زمانہ میں اطبا کی حذاقت انتہائی درجہ پر تھی۔ پس خدا نے معجزہ ان کے سامنے اسی نوعیت کا پیش کیا جس میں ان کو کمال تھا۔ روایت میں ہے کہ بعض اوقات حضرت عیسیٰؑ کے پاس کئی ہزار مریض جمع ہو جاتے تھے، جس کو طاقت ہوتی تھی وہ آپ کے پاس آتا تھا اور جس کو طاقت نہ ہوتی تھی اس کے پاس خود عیسیٰؑ چلے جاتے تھے اور علاج آپ کا دعا سے ہوتا تھا۔

اور علامۂ بیضاوی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

الا کمہ الذی ولدا عمیٰ اوالممسوح العین روی انہ ربما کان یجتمع علیہ الوف من المرضیٰ من اطاق منھم اتاہ ومن لم یطق اتاہ عیسیٰؑ علیہ السلام ومایداوی الابالدعاء۔ (صفحہ ۷۴/)

اکمہ وہ ہے جو اندھا پیدا ہوا ہو یا جس کے ڈھیلا آنکھ کا بہا ہوا ہو، روایت میں ہے کہ بسا اوقات عیسیٰؑ کے پاس کئی ہزار بیمار جمع ہو جاتے تھے جس کو طاقت ہوتی تھی وہ خود آتا تھا ورنہ خود عیسیٰؑ اس کے پاس جاتے تھے اور آپ صرف دعا سے علاج کرتے تھے۔

احیائے اموات کی توضیح میں بھی صاف صاف تصریح کی ہے کہ اس سے مراد حقیقی مردوں کا زندہ کرنا ہے اور علامہ ابوالسعود نے بہت سے واقعات اس کے شاہد میں پیش کئے ہیں کہ مثلاً حضرت عیسیٰؑ نے اپنے دوست حارز کو زندہ کیا۔ اور وہ ایک زمانہ تک زندہ رہا اور اولاد ہوئی، عاشر کی لڑکی کو زندہ کیا اس کے یہاں بچہ پیدا ہوئے ایک عورت کے فرزند کو زندہ کیا، سب سے آخر میں سام بن نوح کو زندہ کیا۔ طول کے خیال سے ہم ان واقعات کو ترک کرتے ہیں۔

(تفسیر ابوالسعود دبر حاشیۂ تفسیر کبیر مطبوعہ مصر صفحہ ۶۸/)

اسی طرح أُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُوْنَ وَتَدَّخِرُوْنَ کے لفظی معنی یہی ہیں کہ میں تم کو بتلاتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا ذخیرہ کرتے ہو اس کا ظاہر یقیناً یہی ہے کہ وہ غیب کی خبریں بیان کرتے تھے اور ہر شخص کو بتلاتے تھے کہ آج تم نے یہ کھایا ہے اور اتنا تمہارے لئے کل کے لئے ذخیرہ کیا گیا ہے۔ اس آیت سے یہ معنی کیوں کر سمجھے جاسکتے ہیں کہ میں تمہیں تعلیم دیتا ہوں کہ جو کچھ تمہارے پاس ہے اسے اللہ کی راہ میں صرف کر دو اور کل کے لئے کچھ نہ رکھو۔ علامۂ بیضاوی لکھتے ہیں۔

أُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَأْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فی بیوتکم

بالمغیبات من اموالکم التی لاتشکون فیھا۔

(صفحہ ۴۷ر)

تم کوخبر دیتا ہوں کہ تم کیا کھاتے ہو اور کیا تمہارے گھر میں رکھا ہے یعنی تمہارے حالات میں سے وہ غیب کی باتیں جن میں تم کو کسی قسم کا شبہ نہیں ہے۔

اسی وجہ سے اس کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے کہ اِنَّ فِیْ ذٰلِکَ لَاٰیَۃً لَّکُمْ اِنْ کُنْتُمْ مُؤْمِنِیْنَ۔

اس میں نشانی (دلیل نبوت) ہے تمہارے لئے، اگر تم ایمان لانے والے ہو۔

ظاہر ہے کہ تبلیغ شریعت اور احکام کا پہنچانا رسول کی شان ہے نہ یہ کہ رسالت کی دلیل ہو۔ لہٰذا ماننا پڑے گا کہ اُنَبِّئُکُمْ بِمَا تَاْکُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ سے قوت اعجاز کا ظاہر کرنا مقصود ہے۔ نزول مائدہ سے وسعت رزق کے معنی مراد لینا بھی قرینہ کا محتاج ہے اور بالکل ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ اگر غور کیا جائے تو آل عمران کی آیت میں بار بار باذن اللہ کی لفظ کو دوہرانا (فَیَکُوْنُ طَیْراً بِاِذْنِ اللّٰہِ وَاُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ وَاُحْیِ الْمَوْتٰی بِاِذْنِ اللّٰہِ) اور سورۂ مائدہ میں باذنی کی لفظ کی تکرار (فَیَکُوْنُ طَیْراً بِاِذْنِیْ وَتُبْرِئُ الْاَکْمَہَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِیْ وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰی بِاِذْنِیْ) صاف بتلاتا ہے کہ وہ افعال قوت بشریہ سے خارج ہیں اور ان کی وجہ سے الوہیت کا دھوکہ ہوسکتا تھا اسی لئے یہ کہا گیا ہے کہ خدا کے احکام سے تم طائر میں جان ڈالتے تھے، خدا کے حکم سے کور مادر زاد اور کوڑھی کو اچھا کرتے تھے، خدا کے حکم سے مردوں کو جلا دیتے تھے، چنانچہ علامہ بیضاوی نے بھی احیی الموتیٰ باذن اللہ کے تحت میں لکھا ہے کہ کرّر باذن اللہ لرفع توھم الا لوھیۃ فان الاحیاء لیس من جنس افعال البشر باذن اللہ کی لفظ کو مکرر کیا گیا تا کہ الوہیت کا توہم نہ ہو کیونکہ مردوں کو زندہ کرنا بشری افعال کی نوعیت سے نہیں ہے (صفحہ ۴۷ر) اگر غور کیا جائے تو ہدایت مردم اور تبلیغ شریعت اور بیان احکام کے معنی قرار دینے کی صورت میں باذن اللہ اور باذنی کی تکرار بالکل فضول ہوجاتی ہے، جس سے کلام الٰہی کی اعجازی بلاغت انکار کرتی ہے۔

وَاللّٰہُ یُحِقُّ الْحَقَّ بِکَلِمَاتِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْمُشْرِکُوْنَ۔

(ماخوذ از ماہنامہ الواعظ لکھنؤ، صفر المظفر ۱۳۴۶ھ اگست ۱۹۲۷ء ص ۱۵ تا ۲۸ر)



سلام

جناب معراج صاحب قدیر وارثی لکھنوی

رو رو کے یہ کہنا مادر کا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
سنسان ہے دشت کرب و بلا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
اے نورِ نگاہِ شاہِ زمن یہ خاک کا بستر گل سا بدن
تنہا تمہیں چھوڑوں کیسے بھلا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
یہ تاریکی، یہ سناٹا، یہ شام بلا، یہ تنہائی
اب کون تمہیں بہلائے گا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
ہیں گریہ کناں سب جن وملک ماتم میں زمیں سے تا بہ فلک
جان و دل مادر تم پہ فدا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
فردوس سے حوریں آئی ہیں تسنیم کے ساغر لائی ہیں
آنکھیں کھولو دیکھو تو ذرا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
دنیا کے مصائب ٹوٹ چکے خیموں کو بھی اعدا لوٹ چکے
ہر گام پہ ہے اک حشر بپا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
تھراتی ہوئی زریں کرنیں منہ چوم کے رخصت ہوتی ہیں
اٹھ بیٹھو کہ سورج ڈوب گیا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی
کیا دشت بلا کا حال لکھوں ہر ذرے سے ہر قطرے سے
معراجؔ یہی آتی تھی صدا جاگو علی اصغرؑ شام ہوئی

